Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1967

سچّے موتی

یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میری اُمّت پر ایک ایسا ہی زمانہ آئیگا جیسا (کبھی) بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ (ان میں بعینہٖ انہی جیسی خصلتیں پیدا ہو جائینگی اور یہ ایک دوسرے کے اس طرح مشابہ ہو جائینگے جس طرح) جوتی کے دو پاؤں ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔ (حتیٰ کہ) یہود کی بہتّر فرقوں میں منقسم ہو گئے تھے تو یہ تہتّر فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ (مشکوٰۃ باب اعتصام بکتاب وسنت)

(اور ظاہر ہے کہ ان بُری خصلتوں کی وجہ سے ذلت وخواری کا جو عذاب یہودیوں پر آیا تھا وہی مسلمانوں پر آئے گا)۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

ادارہ طلوع اسلام کی انقلاب آفرین پیشکش

سلسبیل

قرآنی فکر کا چشمہ رواں — قرآنی بصیرت کی جوئے شیر

یعنی

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے انقلاب انگیز مضامین کا دوسرا مجموعہ

قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم — پرویز کا حسینِ اندازِ بیان — اور

ادارہ کی پیشکش — تینوں یکجا —

کتابت طباعت دیدہ زیب — کاغذ وھائٹ پرنٹنگ — جلد عمدہ — گرد پوش جاذبِ نگاہ —

ضخامت ——— ساڑھے تین سو صفحات

قیمت ——— مجلد آٹھ روپے

ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ
پاکستان ——— ایک روپیہ
ہندوستان
↓
ڈیڑھ روپیہ

بدل اشتراک
پاکستان
سالانہ ——— دس روپے
ہندوستان
سالانہ ——— پندرہ روپے
غیر ممالک
سالانہ ——— ایک پونڈ

جلد نمبر (۲۰) — جولائی ۱۹۶۷ء — نمبر (۷)

فہرست مضامین

۱۔ پیامِ اقبال ——— ۲
۲۔ لمعات ——— ۳
۳۔ پھروانت پیستی ہیں صلیبیں ہلال پر ——— (خورشید عالم صاحب) ——— ۲۶
۴۔ رحمۃ للعالمین ——— (پرویز صاحب) ——— ۳۳
۵۔ دین کی باتیں ——— (مرزا محمد لبیب صاحب) ——— ۴۷
۶۔ نقد و نظر ——— ۴۸
۷۔ سادگی و پُرکاری ——— ۴۹
۸۔ مسلمانوں کی فتوحات ——— (پرویز صاحب) ——— ۵۴
۹۔ افریقہ۔ ایشیا کا عالمی کردار ——— (خورشید عالم صاحب) ——— ۵۷
۱۰۔ رابطۂ باہمی ——— ۶۴
۱۱۔ باب المراسلات ——— (کیا یہ جنگ جہاد ہے) ——— (تقسیم ملک کا نظریہ) ——— (اسلامی جمہوریت) ——— ۶۵
۱۲۔ حقائق و عبر ——— (انہی سے ہمارا نام روشن ہے) ——— (قابل اعتراض طریق) ——— (توکل علی اللہ) ——— (نیا جال لائے ....) ——— (وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے) ——— (پریسیڈنٹ کے خطرہ کا احساس) ——— ۷۳
۱۳۔ درس قرآن کریم ——— ۷۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

پیامِ اقبالؒ

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ دیوارِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح کر دیتا ہے سونے کو گداز

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو!
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی، اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر!

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتہ سے ابتک بے خبر!

پھر سیاست" چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر!

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر!

جو کریگا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر!

نسلِ اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر!

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار!
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

کرمکِ ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

عرب۔ اسرائیلی جنگ آندھی کی طرح اٹھی اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئی۔ لیکن تین ہی چار دن کے اندر اس نے جو قیامت خیز تباہیاں مچادیں، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ ان تباہیوں سے پیدا شدہ نقصانات کی تلافی تو زود یا بدیر ہو ہی جائے گی، لیکن اس سے عربوں ہی کے نہیں، پورے کے پورے عالمِ اسلام کے سینے پر جو گہرے زخم لگے ہیں، ان کا اندمال ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ علاوہ بریں، اس کے اثرات و عواقب اس قدر ہول انگیز ہیں کہ اس وقت دنیا کی ساری چھوٹی چھوٹی نو آزاد ریاستیں یوں ڈری، لرزی اور سہمی ہوئی ہیں جس طرح عقابوں کی جھپٹ سے ڈر کر فاختائیں اپنے گھونسلوں میں دبک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں اس سے زیادہ وحشت انگیز حادثہ شاید ہی کہیں رونما ہوا ہو۔ اور یہ سب کچھ ان قوموں کے ہاتھوں اور سازشوں سے ہوا جو دنیا کو تہذیب و تمدن، عدل و انصاف اور امن و حریت کا سبق دینے کی مدعی اور حقوقِ انسانیت کے تحفظ کی علمبردار بننے کی داعی ہیں ——— یہی وہ قومیں ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

لیکن (ہمارے خیال میں) اس وقت نہ تو عربوں کی سوختہ سامانی پر صفِ ماتم بچھانے کا وقت ہے۔ اور نہ ہی اقوامِ مغرب کی چیرہ دستیوں پر واویلا مچانے کا موقعہ۔ اس وقت حالات کی نزاکت کا صرف ایک ہی تقاضا ہے، اور وہ یہ کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور یہ سوچا جائے کہ وہ کونسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ایسا پھر نہ ہو۔ آج سے چودہ سو سال پہلے، جب مدینے کے مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں، غدار سازشی یہودیوں

کو شکست فاش ملی۔ اور اس سے ان پر کپکپی طاری ہو گئی۔ تو قرآن کریم نے اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ ۔ بانھم قوم لا یفقھون ۔ (۵۹/۱۴) ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے جذبات کی رَو میں ایسے بہ جاتے ہیں کہ عقل و فکر سے کام ہی نہیں لیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان قانونِ خداوندی کی لِم کو سمجھنے کے بجائے انسانوں سے ڈرنے لگ جاتا ہے۔ اگر وہ قانون کی غایت اور کار فرمائی کو سمجھ لے تو انسانوں سے کبھی نہ ڈرے۔ لہٰذا اس وقت ہمارے لئے یہی ضروری ہے کہ جذبات میں بہنے کے بجائے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہم سے فطرت کے کون سے قوانین کی خلاف ورزی ہوئی جس کی وجہ سے ہمیں یہ دن دیکھنے نصیب ہوگئے۔ اگر ہم نے ان غیر متبدل قوانین کو سمجھ لیا جن کے مطابق قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے ہوتے ہیں، تو پھر ہمیں انسانوں سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوگا۔ ڈر تو پیدا ہی قانون کو نہ سمجھنے سے ہوتا ہے۔ یہی اس وقت اس جائزہ سے مقصود ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ افراد ہوں یا اقوام، ان کی زندگی کا راز محاسبۂ خویش (SELF - CRITICISM -) میں مضمر ہوتا ہے۔ اگر کوئی فرد اپنے محاسبہ کی طرف سے غافل ہو جائے تو اسے معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اسے اندر ہی اندر کون سی بلائیں گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ اسی طرح اگر ایک قوم محاسبۂ خویش سے آنکھیں بند کر لے تو وہ اپنے آپ کو خطرات سے محفوظ رکھ ہی نہیں سکتی۔ ہم نے صدیوں سے محاسبۂ خویش کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم پر جب کوئی حادثہ گزرتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم یہ سوچیں کہ ہم میں وہ کون سی کمزوری تھی جس کی وجہ سے ہم اس مصیبت کی آماجگاہ بن گئے۔ ہم فریقِ مخالف کو کوسنے بیٹھ جاتے ہیں ۔ بغداد کی تباہی، ہماری تاریخ کا بہت بڑا الم انگیز حادثہ ہے لیکن ہم اس سے اتنا کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ سب تاتاریوں کی وحشت سامانیوں اور ہلاکت آفرینیوں کی وجہ سے ہوا۔ ہلاکو بڑا ظالم، وحشی اور خونخوار تھا۔ گویا اس تباہی میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔ جرم سارا ہلاکو کا تھا۔ یا مثلاً۔ جب ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی انقلاب انگیز تباہی ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں کہ انگریز بڑا عیار تھا، ہندو بڑا غدار تھا ۔ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہم میں وہ کونسی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے ہم انگریز کی عیاری اور ہندو کی غداری کا شکار ہوگئے۔ یاد رکھئے! جس کے اپنے اندر زندہ رہنے کی قوت ہے اسے باہر کا کوئی دشمن مار نہیں سکتا۔ دشمن تو صرف فریقِ مخالف کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ گِدھ جانوروں کی لاش پر منڈلاتے ہیں، زندہ جانوران کی ..... آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے رہتے ہیں، وہ ان پر جھپٹنے کی کبھی جرأت نہیں کرتے ۔ موت خود ہمارے اپنے اندر سے

اُبھرتی ہے۔ باہر سے تو اس کے صرف محسوس اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

۔۔ ۔۔۔ جب تک پرندے کے بازوؤں میں اُڑنے کی قوت ہے، کوئی شکاری اسے اپنے جال میں نہیں پھنسا سکتا۔ لیکن ع

جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیّاد ہوتا ہے

فطرت کا اٹل قانون یہ ہے کہ ع

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

اور یہ تفسیر ہے اس اصل الاصول کی جسے خدا نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۔ (۱۳/۱۱)

یہ حقیقت ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے۔

دوسری جگہ کہا کہ:-

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ ۔ (۴۲/۳۰)

تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔

اس لئے ہم پر جب کوئی مصیبت آئے تو ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے اندر وہ کون سی خرابی اور کمزوری تھی جس کی وجہ سے ہم اس طرح گرفتارِ بلا ہو گئے۔

پھر ہم میں سے اکثر لوگ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ صاحب! بات یہ ہے کہ مسلمان بڑا صاف دل واقعہ ہوا ہے اس لئے یہ دھوکا کھا جاتا ہے۔ لیکن دھوکا کھا جانا کون سی خوبی ہے؟ فطرت کی میزان میں جس طرح دھوکا دینا جرم ہے اسی طرح دھوکا کھانا بھی جرم ہے۔ جب حضرت عمرؓ کے سامنے ایک شخص نے کہا تھا کہ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا، تو آپ نے کہا تھا کہ بات ادھوری نہ چھوڑو۔ اسے پورا کرو۔ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔ مسلمان میں صفاتِ خداوندی منعکس ہونی چاہئیں۔ خدا کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ اور کوئی شخص خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ خدا نے اس سلسلہ میں جماعتِ مومنین کو خود اپنے ساتھ قوسین (BRACKETS) میں رکھا ہے۔ جب کہا ہے کہ — يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا — یہ لوگ خدا کو اور مومنین کو دھوکا دینا چاہتے تھے — وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ — (۲/۹)۔ یہ لوگ فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ خدا اور مومنین کو دھوکا نہیں دے سکتے — اس لئے کسی سے دھوکا کھا جانا خوبی کی بات نہیں۔ ہماری یہی کمزوری تھی جس

کی بنا پر اقبالؔ نے کہا تھا کہ ؎

مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری
اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

رزمگاہِ سیاست میں آنے والوں کی نگاہیں بڑی عقابی ہونی چاہئیں۔

اب آگے بڑھئیے۔ مسلمانوں کو ایک عرصے سے اس فریب میں مبتلا رکھا گیا ہے کہ خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ یہودیوں کو کبھی سلطنت نہیں مل سکتی۔ یہ خدا کا فیصلہ نہیں ہے۔ ہم اس باب میں اس سے پہلے، طلوعِ اسلام کے صفحات پر کئی مرتبہ بڑی تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ نزولِ قرآن کریم سے قریب ایک ہزار سال پہلے سے، بنی اسرائیل میں جو اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، ان کا فطری نتیجہ ذلت و خواری اور محکومی و محتاجی تھا۔ یہ ذلت و خواری انہیں مختلف اقوام کے ہاتھوں اٹھانی پڑی — نزولِ قرآن کے وقت ان کی یہ خرابیاں اور بھی بڑھ چکی تھیں۔ اس لئے قرآن نے ان کی ذلت و رسوائی کی زندگی کو اس دعوے کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر کے کہا کہ دیکھ لو! قوانینِ خداوندی سے انحراف کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا انہیں دنیا میں کبھی بھی حکومت و سطوت کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی تو اس سلسلہ میں اس حقیقت کو سامنے رکھئیے کہ قوموں کی تباہی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس تباہی کے بعد اس قوم کا اجتماعی تشخص ہی باقی نہ رہے۔ جیسے' اکال الامم — بھارت ماتا — باہر سے آنے والی بیشتر قوموں کو اس طرح ہضم کر گئی، کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس قسم کی قوموں کیلئے بازآفرینی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری قسم کی قومیں وہ ہیں جو اپنی تباہی کے باوجود اپنا قومی تشخص قائم رکھتی ہیں۔ ان قوموں کی صورت یہ ہے کہ اگر وہ ان خرابیوں کو رفع کر لیں جن کی وجہ سے ان پر ذلت و ادبار کے بادل اُمڈ آئے تھے اور ان کی جگہ وہ صلاحیتیں پیدا کر لیں جن سے (قرآن کے الفاظ میں) "مردہ قومیں زندگی حاصل کر لیتی ہیں" تو انہیں پھر حیاتِ تازہ مل سکتی ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے اسلاف میں کسی زمانے میں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، تو ان کی آنے والی نسلوں میں اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ ان خرابیوں کو دور کر کے، از سرِ نو اپنی صلاحیتیں بیدار کر لیں۔ یہ ہماری خوش فہمی تھی جو ہم نے سمجھ لیا کہ یہودیوں کو ابد الاباد تک حکومت نہیں مل سکتی۔ لیکن قانون تو کسی کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کے فیصلے حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس نے اپنے فیصلوں کے متعلق (خود مسلمانوں سے کہہ دیا کہ) — لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ۔ (۴/۱۲۳) یہ نہ تمہاری

آرزوؤں کے مطابق ہوں گے' نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق ۔ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (۴/۱۲۳)
جو غلط کار ہوگا وہ اپنی غلط روش کا نتیجہ بھگتیگا۔ جب وہ غلط روش چھوڑ دے گا تو نقصان سے بچ جائے گا۔ یہ
تو عیسائیت کا عقیدہ ہے کہ انسان کے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کی لغزش کی وجہ سے ہر انسانی بچہ اپنی
پیدائش کے ساتھ، اُن کے گناہوں کا بوجھ لے کر دنیا میں آتا ہے۔ قرآن اس باطل عقیدہ کو مٹانے کے لئے
آیا تھا۔ لہٰذا، دو چار ہزار سال پہلے کی کسی نسل (G E N E R A T I O N) کی غلطیوں کی پاداش میں،
اس کی آنے والی تمام نسلوں پر باز آفرینی کے دروازے بند کر دینا ۔۔۔ ہی نہ سنّت خداوندی رہا ۔۔۔ بنابریں،
جس طرح ہمارے اسلاف کے کارنامے ہمارے لئے عزت و سطوت کی زندگی کا موجب نہیں بن سکتے، ہمیں عزت
اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ہم خود قابلِ عزت کام کریں۔ اسی طرح یہودیوں کے اسلاف کے ذلت و
خواری پیدا کرنے والے کام، ان کی موجودہ نسل کے لئے ذلت و خواری کا سبب نہیں بن سکتے۔ اگر وہ ان کی
روش کو چھوڑ کر صحیح روش اختیار کر لیتے ہیں تو انہیں اپنے کاموں کا بدلہ ملے گا۔ اس باب میں قرآن کا فیصلہ
بڑا واضح ہے جب اس نے کہا کہ

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ
وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (۲/۱۴۱)

یہ (تمہارے اسلاف) اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال
ان کے ساتھ تھے۔ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تم سے یہ نہیں
پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ (تمہارا فیصلہ اس سے ہوگا کہ تم
نے کیا کیا ہے)

اس لئے نہ مسلمان، بلند کردار اسلاف کی اولاد ہونے کی بنا پر مقرب بارگاہِ خداوندی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی
یہودی، اپنے غلط کار اسلاف کی نسل ہونے کی وجہ سے راندۂ درگاہ، ۔۔۔ کارگہِ حیات میں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

اگلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ اس دنیا کے طبعی معاملات خدا کے مقرر کردہ قوانینِ فطرت (LAWS OF
NATURE.) کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اور قوانینِ فطرت کی نگاہ میں کافر و مومن کی کوئی تمیز اور فرق
نہیں۔ اگر کوئی "شیر سنگھ یا رام داس" فطرت کے قاعدے کے مطابق اپنی زمین تیار کر کے اس میں کھیتی
کرتا ہے تو اس کی بھی اتنی ہی فصل ہوگی جتنی کسی "عبدالرحمن" کاشتکار کی جو انہی قواعد کے مطابق کاشت

کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر "شیر سنگھ یا رام داس" ان قواعد کی پابندی کرتے ہیں اور "عبدالرحمٰن" ان سے اعراض برتتا ہے تو "شیر سنگھ اور رام داس" کی "کوٹھیاں" دانوں سے بھر جائینگی، "عبدالرحمٰن" کی جھولی خالی رہ جائے گی۔ اس باب میں فطرت نہ کسی سے رعایت برتتی ہے، نہ کسی سے بیر رکھتی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے کہ — كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ — جو چیزیں عطیۂ خداوندی کے طور پر مائدۂ ارض پر بکھری ہوئی ہیں، انہیں جو بھی ہمارے قانون کے مطابق حاصل کرنا چاہے، ہم اسے برابر آگے بڑھائے جاتے ہیں — وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۲۰) یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہم راستے میں پھاٹک لگا دیں کہ اس سے آگے "عبدالرحمٰن" تو جا سکتا ہے "شیر سنگھ اور رامداس" نہیں جا سکتے —

ہست ایں میکدہ دعوتِ عام است اینجا

— اپنی اپنی ہمت اور کوشش کے مطابق جو جتنا حاصل کرنا چاہے، حاصل کرلے۔ یہودیوں کی ذلت کی بنیاد یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ — نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ — ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں۔ اس لئے ہم کچھ کریں یا نہ کریں (یا جو جی میں آئے کریں) ہمیں زندگی کی سرفرازیاں ازخود حاصل ہوتی جائینگی۔ ان کا یہ عقیدہ ان کے لئے ترکِ عمل کا باعث بن گیا جس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ انہوں نے اس عقیدہ کو ترک کر دیا تو ذلت و خواری کے عذاب سے نکل گئے۔ ان کی جگہ ہم نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ "ہم خدا کے محبوب کی محبوب امت ہیں" اس لئے ہم جو بھی میں آئے کریں، ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ تو اس غلط عقیدہ کے فطری نتیجہ کی رُو سے، جس عذاب میں یہودی گرفتار تھے اس میں ہم ماخوذ ہیں۔ یاد رکھئے! خدا کے ہاں نہ کوئی قوم (محض کسی نسبت کی بنا پر) چہیتی ہوتی ہے، نہ سوتیلی۔ وہاں تو اصول یہ ہے کہ — مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ۔ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲/۸۱) جو کوئی بھی غلط روش اختیار کرے اور اس کی غلط اندیشیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیں تو اس کی زندگی جہنم کی ہوگی۔

طبیعی قوانین کے سلسلہ میں، خدا نے انسان سے برملا کہہ دیا کہ:-

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)

اس زمین میں ہی نہیں بلکہ جو کچھ فضا کی بلندیوں میں ہے، اسے بھی خدا نے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر رکھا ہے۔

یہ خطاب "انسان" سے ہے۔ اس میں بھی مومن اور کافر میں کوئی تمیز نہیں۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر

لینے کی امکانی صلاحیتیں تمام انسانوں کے اندر ہیں۔ جو قوم انہیں زیادہ مسخر کرلے گی وہ زیادہ طاقتور ہو جائے گی۔ یوں تو فطرت کی قوتوں سے انسان کبھی بھی بے نیاز نہیں رہا، لیکن ہمارے زمانے میں، سائنس کے نت نئے انکشافات کی وجہ سے، ان قوتوں کا دائرہ اثر و نفوذ حد درجہ فراموش ہوتا جارہا ہے۔ لہذا، جو قوم تسخیر فطرت کی طرف سے تغافل یا تساہل برتے گی وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی ۔۔۔ اور زندگی کی دوڑ آجکل اسقدر تیز ہو رہی ہے کہ اگر کوئی دوڑنے والا پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے بھی بیٹھ جائے تو پیچھے سے آنے والے اسے روندتے ہوتے آگے نکل جائیں گے۔ اور وہ ان کے پاؤں تلے کچلا جائے گا۔ اگر فطرت کی قوتیں کسی ایسی قوم کے ہاتھ میں ہوں، جو مستقل اقدار خداوندی پر ایمان رکھتی ہے تو وہ ان قوتوں کے ماحصل کو نوع انسانی کی عام بہبود اور کمزوروں اور ناتوانوں کو ان کے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے صرف کرے گی۔ لیکن جو قوم ان اقدار پر ایمان نہیں رکھتی، وہ ان قوتوں کو کمزوروں اور ناتوانوں کو کچلنے کے کام میں لائے گی۔
اس وقت یہ قوتیں دنیا میں ان قوموں کے ہاتھ میں ہیں جو ان اقدار پر نہ صرف یہ کہ یقین نہیں رکھتیں، بلکہ انہیں اپنی ترقی کے راستے میں سنگ گراں تصور کرتی ہیں۔ لہذا کسی کمزور قوم کا یہ سمجھنا کہ یہ طاقتور قومیں اس کی بے چارگی کا مداوا سوچیں گی، یا کسی جابر و ظالم سے اس کے حقوق واپس دلادیں گی اپنے آپ کو فریب میں رکھنے کے مترادف ہے۔ یہ قومیں نہیں، ڈاکوؤں کے گروہوں کی (TRADE UNIONS) ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

تاریخ عالم میں ایک دور وہ بھی آیا تھا جب مذہب نے یورپ کی عیسائی قوموں کو یہ سبق پڑھا رکھا تھا کہ یہ دنیا قابلِ نفرت ہے ۔۔۔ خدا کے بندوں کی بادشاہت اس زمین پر نہیں، آسمان پر ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا تو ایک طرف، وہ ان قوتوں سے متمتع ہونے کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔ عین اسی زمانے میں عرب سے ایک قوم اٹھی جس کے دین نے انہیں بتایا کہ خدا نے یہ ساری کائنات تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہے ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

نتیجہ اس کا یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ قوم ساری دنیا پر چھا گئی ۔۔۔ اور چونکہ یہ قوم مستقل اقدار خداوندی پر ایمان رکھتی تھی، اس لئے ان کی تسخیر فطرت نوع انسانی کے لئے سحاب کرم بن گئی۔
اس کے بعد اس قوم کے خلاف ایک سازش ہوئی۔ اور ان کے دین کو اسی قسم کے مذہب میں بدل

دیا گیا جس مذہب نے اقوامِ مغرب کو یوں دنیا سے بیگانہ بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے تسخیرِ فطرت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری طرف اقوامِ مغرب نے اپنے مسکنت فروش مذہب کو خیرباد کہہ کر فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینے کے لئے آسمانوں پر کمندیں پھینکنا شروع کر دیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مسلمان آج اس مقام پر ہے جہاں آج سے پانچ چھ سو سال پہلے یورپ کی عیسائی اقوام تھیں۔۔۔ اگر مسلمان، زندگی کی دوڑ میں اقوامِ عالم کے ساتھ (کم از کم) دوش بدوش چلنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ مذہب کے پیدا کردہ اس فرسودہ تصور کو چھوڑ کر، سائنس ٹیکنالوجی میں تیزی سے قدم بڑھائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ میں سائنٹسٹ کو وہ عزت کا مقام دیا جائے جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے۔۔۔ ۔۔ ۔۔۔

۔۔ ۔۔ جیسا کہ طلوعِ اسلام کی مئی ۱۹۶۷ء کی اشاعت کے ایک مقالہ میں بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم تو "علماء" کہتا ہی سائنس دانوں کو ہے۔ اس کے برعکس، ہمارے ہاں "عالم" اسے کہا جاتا ہے جو ایک سوئی تک بنانا نہیں جانتا۔ سوئی بنانا تو ایک طرف، ان میں بیشتر ایسے ہیں جو سوئی میں تاگا تک پرونا نہیں جانتے۔ اب ظاہر ہے کہ جن قوموں کی امامت اس قسم کے افراد کو حاصل ہو، وہ قومیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں اقوامِ عالم کا کیا مقابلہ کر سکیں گی؟۔۔۔ اگلے دنوں، دیہی اکادمی پشاور کے ڈائریکٹر، مسٹر محمد مسعود (سی۔ ایس۔ پی) نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ اس وقت ملک میں قوم کا کم از کم۔۔۔

ساٹھ کروڑ روپیہ

سالانہ، مساجد کے اماموں اور خطیبوں کی نذر ہو جاتا ہے اور اس میں وہ روپیہ شامل نہیں جو روحانی پیشواؤں اور مذہبی راہ نماؤں کو بطور نذرانہ دیا جاتا ہے۔ یہ صرف ایک ملک (پاکستان) کے اعداد و شمار ہیں تمام ممالک اسلامیہ میں اس مد پر کتنا روپیہ صرف ہو رہا ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر یہی روپیہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں صرف کیا جائے تو آپ سوچئے کہ اس کے نتائج کیا ہوں؟ اور جب اس کے ساتھ مسلمان سائنٹسٹ کو مستقل اقدار خداوندی کی بھی تعلیم دی جائے اور اسلامی مملکتیں ان اقدار پر عمل پیرا ہوں تو سوچئے کہ یہ دنیا کس طرح جنتِ ارضی نہ بن جائے۔۔۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اگر مسلم ممالک نے زندہ رہنا ہے تو انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں باقی اقوام سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایسی اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے ان کی حکومت و سطوت ان سے چھن گئی۔ اور وہ دنیا کی ذلیل ترین قوم بن گئی۔ قرآن کریم نے ان خرابیوں کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس قوم کو مطعون کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ

مسلمانوں کو متنبہ کرنا چاہتا تھا کہ دیکھنا! کہیں تم میں اس قسم کی خرابیاں پیدا نہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا، تو جو حالت بنی اسرائیل کی ہوئی وہی حالت تمہاری ہو جائے گی۔ یہ خدا کا قانونِ مکافات ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ تم اس کے قانونِ مکافات میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ ہم ان خرابیوں میں سے چند ایک اصولی امور کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ ان میں کون سی خرابی ایسی ہے جو (یہودیوں میں تھی) اور اب ہم میں پیدا نہیں ہو چکی! قلتِ گنجائش کی وجہ سے ہم ان کا ذکر محض اشارۃً کریں گے۔ آپ انہیں غور سے دیکھئے:۔

(۱) خود اپنی قوم کے ساتھ غداری ان کا شیوہ تھا۔ ان کے اربابِ اقتدار کرتے یہ تھے کہ پہلے ایسے حالات پیدا کر دیتے جن سے کمزور طبقہ دوسروں کا محتاج ہو جائے اور پھر "نیک بننے" کے لئے ان کی بہبود کے لئے خیراتی فنڈ اکٹھا کرتے۔ (۲/۸۵)

(۲) عہد شکنی اور اصول فراموشی ان کا عام شعار تھا۔ (۲/۱۰۰)

(۳) وہ محنت سے سخت جی چراتے تھے اور محض روپیہ لگا کر دوسروں کی کمائی کو ہتھیا لیا کرتے تھے۔ یعنے ان کے ہاں نظامِ سرمایہ داری عام تھا۔ (۲/۹۶) ۔۔۔ اور یہ سرمایہ دار خود اپنی ہی قوم کا خون چوستے تھے۔ چنانچہ قرآن نے بتایا ہے کہ فرعون اور ہامان تو قومِ مخالف سے متعلق تھے، لیکن قارون خود بنی اسرائیل میں سے تھا۔

(۴) ان میں ہوسِ زر اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ ان کا مقصدِ حیات روپیہ حاصل کرنا رہ گیا تھا۔ اور اس میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی۔ (۵/۶۲)

(۵) معاشرہ میں اخلاقی برائیاں اس قدر عام ہو چکی تھیں کہ کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں تھا۔ (۵/۷۹)

(۶) مذہبی پیشوائیت کا اقتدار اس قدر غالب آ چکا تھا کہ وہ خدائی مسند پر بیٹھ گئے تھے اور اپنے احکام کو خدا کی شریعت کہہ کر لوگوں سے منواتے تھے۔ (۹/۳۱)

(۷) یہ مذہبی علماء اور روحانی مشائخ ہر طریق سے لوگوں کا مال ہڑپ کر جاتے تھے اور انہیں کبھی خدا کے راستے کی طرف آنے نہیں دیتے تھے۔ (۹/۳۴)

(۸) دین فروشی ان مذہبی راہ نماؤں کا عام شیوہ تھا۔ (۵/۶۹)

(۹) ان کے اربابِ اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ وہ کرتے کچھ نہیں تھے، لیکن چاہتے یہ تھے کہ لوگ اُن کاموں کی وجہ سے ان کی تعریف کریں جنہیں وہ کر کے نہیں دکھاتے تھے۔ (۳/۱۸۷)

(۱۰) قوم میں بات بات پر اختلاف ہوتا تھا۔ اور اس سے ان میں بے شمار فرقے پیدا ہو چکے تھے (۶/۱۵۹)

یہ اختلافات مذہبی پیشواؤں کی باہمی ضد اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کے جذبات کی بنا پر پیدا کئے اور قائم رکھے جاتے تھے۔ (۴۵/۱۷)

(۱۱) ان کے علماء کے پاس کتابوں کے انبار در انبار لگے رہتے لیکن حرام جو وہ ان میں سے کسی پر عمل کرتے۔ ان کی مثال ایسی تھی جیسے گدھے پر بڑی بڑی مقدس کتابوں کا بوجھ لاد کر سمجھ لیا جائے کہ وہ بڑا مقدس بن گیا ہے۔ (۶۲/۵)

(۱۲) وہ اپنے آپ کو "خدا کی چہیتی اولاد" سمجھتے تھے اس لئے اس زعمِ باطل میں مبتلا تھے کہ انہیں عمل کی ضرورت نہیں۔ وہی جنت کے واحد اجارہ دار ہیں۔ (۲/۸۰ ، ۲/۱۱۱)

(۱۳) اندھی تقلید ان کا شیوہ تھا۔ اور وہ کوئی نئی بات سننے اور اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے (۲/۸۸)

(۱۴) بلا منت، ہوسِ زر نے ان میں حرکت و عمل کی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ موت کے تصور سے ان کی جان جاتی تھی۔ (۲/۹۶)

(۱۵) انہیں اگر کبھی دشمن کے مقابلہ کے لئے ہانک کر لے جایا جاتا، تو وہاں سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھتے۔ (۲/۲۴۶)

(۱۶) معاشرتی ضوابط کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر سخت گراں گزرتیں۔ اور ان سے بچ نکلنے کے لئے وہ چور دروازے تراشتے رہتے۔ (۲/۱۴۳) اسی لئے منافقت ان کے رگ و ریشے میں رچ چکی تھی۔

(۱۷) ان کا اپنا مثبت نظریۂ زندگی کوئی نہیں رہا تھا۔ اس لئے دوسروں کی نقالی میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔ (۲/۱۴۴)

(۱۸) ان کی ساری توانائیاں باہمی سر پھٹول اور انتشار میں ضائع ہو جاتی تھیں۔ (۵۹/۱۴)

یہ تھیں مختصراً وہ اخلاقی خرابیاں جو ان میں عام ہو چکی تھیں اور جن کا نتیجہ یہ تھا کہ ان سے سرفرازیاں چھن گئیں۔ وہ سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی سے محروم ہو گئے اور ان پر ذلت و خواری کی مار ماری گئی۔ ان پر سب سے بڑا عذاب یہ طاری ہوا کہ ان کی اجتماعیت فنا ہو گئی۔ مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد، ان کی زندگی انفرادی رہ گئی۔ ان کا یہی وہ سوختہ بخت مآل تھا جس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ ؎

عبرتے، اے مسلمِ روشن ضمیر
از مآلِ امتِ موسےٰ بگیر

داد چوں او قوم مرکز را ز دست
رشتۂ جمعیتِ ملت شکست
قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

ان اصولی مباحث کے بعد ہم اس حادثہ فاجعہ کے اسباب و علل کی طرف آتے ہیں جس سے پیدا شدہ اضطراب ان مباحث کا محرک ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یوں تو دنیا کی کوئی قوم بھی اسلام کی دوست اور بہی خواہ نہیں، لیکن یہود و نصاریٰ کو اس سے ازلی عداوت ہے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے ان مذاہب کا دنیا میں بڑا چرچا تھا، لیکن اسلام کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا۔ اس لئے کہ یہ دونوں خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے دین کی مسخ اور محرف شدہ صورتیں تھیں، اور اسلام اصلی شکل میں دینِ خداوندی تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جعلی مال کبھی اصلی کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اس شکست نے ان کے دل میں اسلام کے خلاف اس قدر شدید جذباتِ نفرت و انتقام ابھار دیئے کہ تیرہ سو سال گزرنے کے باوجود ان کی شعلہ سامانیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ اور زیادہ بھڑکتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی عداوت کے باوجود، اسلام کے خلاف یہ دونوں متحدہ محاذ بنا کر صف آرا ہیں۔ اس محاذ کو اور محکم بنانے کے لئے حال ہی میں عیسائی دنیا نے (اپنی کتبِ مقدسہ کے کھلے ہوئے بیانات کے علی الرغم) یہ اعلان کیا ہے کہ حضرت عیسےؑ کی تصلیب کے ذمہ دار یہودی نہیں تھے، رومی تھے۔ مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ ان کے دل سے باہمی عداوت کے جذبات مٹ جائیں۔ اور یہ پوری یک دلی کے ساتھ، اسلام کے مقابلہ کے لئے صف آرا ہو جائیں۔ خود اسرائیلی سلطنت کی تخلیق کا یہی مقصد تھا۔ لہٰذا ان قوتوں کا مسلمانوں کے کسی ملک کے خلاف بھی جارحانہ اقدام کیوں نہ ہو اور اس کے لئے بظاہر اسباب و وجوہ کچھ بھی کیوں نہ دکھائی دیں، وہ درحقیقت، اسلام کے خلاف اسی جذبۂ انتقام کا پیدا کردہ ہو گا۔ اس لئے ان کا وہ اقدام اسی خاص قوم کے خلاف نہیں ہوتا، پورے کے پورے عالمِ اسلام کے خلاف ہوتا ہے۔

لیکن دوسری طرف فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مسلمانوں کو اسلام کے ساتھ نام کی نسبت کے علاوہ کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ان تمام سعادات و برکات سے محروم ہو چکے ہیں جو اسلام کی متابعت کا فطری نتیجہ تھیں۔ لیکن اسلام دشمن قوتیں انہیں بدستور اسلام کا علمبردار سمجھتی ہیں اس لئے وہ اسلام کے

خلاف اپنا انتقام انہی سے لیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہماری دوہری پٹائی ہو رہی ہے ۔۔ ایک تو دین کے نظام سے انحراف کی وجہ سے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے عذاب' اور دوسرے' اسلام کے نام سے نسبت رکھنے کے جرم میں' اسلام دشمن قوتوں کی طرف سے انتقامی اقدامات کی پیدا کردہ تباہیاں۔ قرآن کریم نے اسی کو ضِعْفُ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفُ الْمَمَاتِ (۷۵؍۱۷) کا عذاب کہا ہے۔ یعنی زندگی اور موت دونوں میں دوہرا عذاب۔

اندریں حالات مسلمانانِ عالم کو ایک دفعہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ وہ کون سی زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے متعارف رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنا نظامِ حیات بھی اسلام کے مطابق متشکل کرنا چاہیئے۔ اس صورت میں نہ صرف یہ کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی' بلکہ' اقوامِ عالم کی امامت (لیڈرشپ) ان کے حصہ میں آجائے گی۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ جسے ہم محض برنبائے عقیدت پیش نہیں کر رہے بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ایسا کہہ رہے ہیں۔ نوعِ انسانی نے آخر الامر اسی نظام کی طرف آنا ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ (وہ ہماری' آپ کی سعی و کاوش کے بغیر بھی از خود آگے بڑھتا اور باطل نظامہائے حیات پر غالب آتا چلا جا رہا ہے لیکن اس کی رفتار بڑی سُست ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں "خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ لیکن اگر ہم بدقسمتی سے سمجھتے ہیں کہ اس نظام کا اختیار کرنا ہمارے بس کی بات نہیں' تو پھر ہمیں اسلام کے ساتھ اپنی لفظی نسبت بھی نہیں رکھنی چاہیئے۔ اس سے ہم کم از کم اس عذاب سے تو بچ جائیں گے جو اقوامِ عالم محض اسلام کے ساتھ نسبت کی وجہ سے' ہم پر روا رکھتی ہیں۔

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مسلمان اسے کبھی برداشت نہیں کر سکے گا کہ وہ اسلام کے ساتھ اپنی نسبت منقطع کر لے۔ اسے اسلام کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ اس وقت اسے' اُس اسلام کے ساتھ شیفتگی ہے جسے اسلام کہہ کر اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن جو درحقیقت اسلام نہیں۔ جب اس کے سامنے حقیقی اسلام آجائے گا تو اسے اُس سے بھی اتنی ہی (بلکہ اس سے بھی زیادہ) محبت ہو جائے گی۔ لہٰذا' مسلمانوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ موجودہ مذہبِ اسلام کی جگہ اس اسلامی نظام کو اختیار کر لیں جسے الدّین کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اور جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے ۔۔۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اس کے بعد ہم عرب ممالک کی طرف آتے ہیں۔

مصر کی قوم خوش بخت تھی کہ اسے ناصر جیسا مشفق اور بلند ہمت سربراہ مل گیا۔ اس نے ملک میں جو جزئی اصلاحات کی ہیں، ان سے قطع نظر، اس کی ضربِ کلیمی نے جس طرح ملوکیت، جاگیرداری اور مذہبی پیشوائیت کے بتوں کو پاش پاش کر کے، قوم کو ان کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی ہے، وہ اس قوم پر اس قدر احسانِ عظیم ہے جس سے وہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اسی احسان کا احساس و اعتراف ہے، جو اس قوم نے، اس قدر شکست فاش اور الم انگیز تباہیوں کے باوجود، اپنے اس محسن کو مجبور کیا ہے کہ وہ زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھے۔ مستحقِ مبارکباد ہے وہ قوم جس نے ایسا مستحسن فیصلہ کیا ہے (وہ فیصلہ، جس نے نہ معلوم کتنے دشمنوں کی سازش کو ناکام بنا کر ان کی مشئوم امیدوں کو خاک میں ملا دیا ہے) — اور درخورِ ستائش ہے وہ سربراہ جسے اس قسم کی احسان شناس قوم مل گئی ہے۔ اس سے، مصر کے مستقبل کے متعلق ہماری بڑی امیدیں بندھتی ہیں۔ خدا اس قوم کے اس احساس کو بیدار رکھے اور اسے عدو کی نظرِ بد سے بچائے۔)

ناصر نے اس حقیقت کا بھی احساس کیا کہ مشرقِ وسطیٰ کی تباہی کا باعث، عرب ممالک کا باہمی اختلاف ہے۔ اس لئے اس نے چاہا کہ انہیں کسی طرح ایک رشتہ میں پرو دیا جائے۔ اس کی سمجھ میں یہ رشتہ — عرب نیشنلزم یا نسل کی بنیادوں[1] پر تشکیلِ قومیت آیا۔ یہ اس کی اجتہادی غلطی تھی۔ اسلامی نقطۂ نظر تو خیر بہت دور کی چیز ہے، محض عمرانی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کا یہ فیصلہ صحیح نہیں تھا۔ نسل کی بنیادوں پر قوم کی تشکیل اُس زمانے کی یادگار ہے جب انسان، اپنے عہدِ طفولیت میں، ہنوز قبائلی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس وقت نسل کے علاوہ کوئی اور وجۂ اشتراک اس کی سمجھ میں آ نہیں سکتی تھی۔ (خدا کے دین نے کونسی وجۂ اشتراک بنائی، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا)

انسان، اُس دور سے آگے نکل آیا تو اُس نے وطنیت کی بنا پر قومیت کی تشکیل کی۔ یہی نیشنلزم اِس وقت دنیا کا عام چلن ہے۔ عربوں کے ہاں خود یہی نیشنلزم رائج ہے۔ یعنی اُن میں سے ہر ایک، اپنے اپنے علاقہ میں جداگانہ قومی حیثیت لئے ہوتے ہے۔ اب بجائے اس کے کہ ان کا قدم آگے بڑھایا جاتا — نسل پرستی کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے نظریہ سے انہیں صدیوں پیچھے لوٹنے کے لئے کہا گیا۔ وہ پیچھے لوٹ سکتے نہیں۔ یہ اصولِ عمرانیت کے خلاف ہے۔ انسان جن نظریات یا تمدنی تقاضوں کو پیچھے چھوڑ آتا ہے، ان کی طرف واپس نہیں جایا کرتا۔ وہ یا تو آگے بڑھتا ہے اور یا وہیں منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔

---

[1] آگے بڑھ کر اس نے محض عربی زبان کے اشتراک کی صورت اختیار کر لی۔

لہٰذا نسل پرستی (یا عربی زبان کا اشتراک) ان مختلف مملکتوں میں بسنے والوں کے لئے کبھی وجۂ جامعیت نہیں بن سکتا۔ ذرا سوچیئے کہ صحرائے نجد میں بسنے والے کسی "قریشی" پر کوئی مصیبت آئے تو وہ کون سا جذبہ محرکہ ہے جس سے مراکش (یا پاکستان) میں بسنے والے قریشی کے دل میں ٹیس پیدا ہوگی؟ یہ تصور، کہ قرنہا قرن پہلے، قریش نامی ایک شخص ان کا جدِ اعلیٰ تھا، ان دونوں کے قلوب میں کوئی ہم آہنگی پیدا نہیں کرسکتا۔ اگر وہ دونوں ایک ملک میں بستے ہیں اور اس ملک پر کوئی زد پڑتی ہے تو وہ دونوں اس نقصان کے احساس میں تو مشترک ہونگے۔ لہٰذا نسل پرستی کی بنا پر قومیت کی تشکیل کی کوشش، وطنیت کی بنا پر تشکیلِ قومیت سے بھی زیادہ ناکام رہے گی[1]۔ اس بنیاد کی کمزوری کا اندازہ اس سے لگایئے کہ عرب اپنے آپ کو حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کہتے ہیں اور یہودی اپنے آپ کو حضرت اسحٰقؑ کی نسل سے بتاتے ہیں۔ عربی النسل بنیاد کو ایک پشت آگے بڑھا کر، حضرت ابراہیمؑ تک لے جایا جائے، تو عرب اور یہودی، دونوں ایک قوم کے افراد قرار پا جاتے ہیں اور یہ تصور جس قدر خلافِ حقیقت اور لغو ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اسلام نے نسل کے اشتراک کو وجۂ جامعیت قرار نہیں دیا، اور نسلی مفاخر کو (حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے مطابق) پاؤں تلے روند ڈالا۔

لیکن اگر ناصر کا نظریۂ نسل پرستی، عربوں کو ایک قوم بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکا (اور نہ ہوسکتا ہے) تو باقی عربوں کا نظریۂ وطنیت ان میں کس طرح باہمی مودّت اور اخوت پیدا کرسکتا ہے۔ اور تو اور، اب تو خود اقوامِ مغرب کے مفکرین ـــــ جو چند ہی سال پیشتر، نیشنلزم کو آیۂ رحمت قرار دیا کرتے تھے ـــــ چلا اٹھے ہیں کہ اس سے باہمی نفرت و عداوت کے ایسے تباہ کن جذبات ابھرتے ہیں جنہیں کوئی تدبیر مٹا ہی نہیں سکتی۔ اس لئے وطنی نیشنلزم کی موجودگی میں، تمام عرب کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ تمام عربوں کا ایک قوم بننا تو ایک طرف، ان کے بیشتر ممالک میں، ایک وطن کے اندر بسنے والے عرب بھی ایک قوم کی حیثیت

---

[1] جماعتِ اسلامی نے صدر ناصر کو بدنام کرنے کے لئے جو مہم جاری کر رکھی ہے، اس سلسلہ میں ان کی طرف سے بھی صدر ناصر کے خلاف یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ اس نے نسل پر قومیت کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ اعتراض صحیح ہے لیکن جماعتِ اسلامی جس مقصد کے لئے یہ کچھ کر رہی ہے وہ تو لوگوں سے پوشیدہ نہیں۔ اس نے جس طرح اپنے دیگر مقاصد کے حصول کیلئے اسلام کو اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے، اسی طرح وہ صدر ناصر کے خلاف اس حربے کو استعمال کر رہی ہے ورنہ اس جماعت کے ممدحین کے ہاں کتنی باتیں خلافِ اسلام ہوتی ہیں جن کا یہ کبھی نوٹس ہی نہیں لیتی۔ ویسے بھی جس جماعت کا امیر اپنے نام کے ساتھ التزاماً "مودودی" لکھتا ہو اسے نسل پرستی کیخلاف لب کشائی کا کیا حق حاصل ہے۔ اپنے جدِ امجد کیساتھ نسبت، انفرادی نسل پرستی ہے؛ ناصر کی عرب نیشنلزم اجتماعی نسل پرستی ہے۔

اختیار نہیں کر سکے۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔ عربوں کے بعض ممالک میں ابھی تک ملوکیت (بادشاہت) کا دور دورہ ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ملوکیت کے تابع صرف افراد بستے (یا سانس لیتے) ہیں۔ وہاں قوم کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ پھر جن ممالک میں طبقاتی تفریق اس قدر شدید ہو، ان میں قومی زندگی کا تصور کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ عربی ممالک میں طبقاتی تفریق کس قدر شدید ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (ہمارے ایک دوست نے جو حج کر کے آئے ہیں، خود اپنا واقعہ سنایا کہ) انہوں نے تربوز کھا کر اس کا چھلکا پھینکا، تو دو بھوکے عرب اس پر اس طرح لپکے جس طرح ..... [1] ادھر زمین پر یہ دو انسان، تربوز کے پھینکے ہوئے چھلکوں پر یوں جھپٹ رہے تھے، اور اُدھر آسمان پر ان کے سروں کے اوپر سے وہ جہاز گزر رہا تھا جس میں وہاں کے شیوخ کی ہمگیات بال کٹوانے بیروت تشریف لے جا رہی تھیں۔ جن ممالک میں طبقاتی تفریق کا یہ عالم ہو، وہاں قوم کی اجتماعیت کا کیا سوال؟ اجتماعی زندگی تو پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب ہر فرد، اس زندگی میں اپنا مفاد برابر کا دیکھے اور پائے۔ لہٰذا، ناصر کا نظریۂ نسل پرستی ہو یا دیگر ممالک کا نظریۂ وطنیت، ان سے وحدت پیدا ہو نہیں سکتی۔ وحدت پیدا ہو سکتی ہے صرف اسلام کے عطا کردہ نظریۂ قومیت (تشکیلِ امت) سے — وہ نظریہ یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد، آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) کا اشتراک ہونا چاہیئے، نہ کہ خون اور خاک کے رشتے۔ دنیا کے جو انسان ایک جیسا نظریۂ حیات رکھتے ہوں، وہ ایک قوم کے افراد — جو اس کے خلاف نظریہ کے حامل ہوں وہ دوسری قوم کے ارکان۔ یہی وہ رشتہ ہے جس سے سری نہیں بلکہ دل بھی آپس میں جڑتے ہیں۔ اور اسی سے وہ گہرا تعلق پیدا ہوتا ہے جسے دنیا کی کوئی قوت توڑ نہیں سکتی۔ جب اس رشتہ کی بنا پر ایک قوم (امت مسلمہ) کی تشکیل ہوئی تھی تو اس تعلق کی محکمیت کے نظائر ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔ مسلمانوں نے (بعد میں) اس بنیاد کو فراموش کر دیا اور رنگ اور وطن کے امتیازات میں کھو گئے۔ اس لئے یہ اُمت بھی مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی، اور ان کی وحدت ختم ہو گئی۔ آئیڈیالوجی کے اشتراک پر جو اُمت متشکل ہوتی ہے اس میں وحدت کا انداز کیا ہوتا ہے، موجودہ دور کے مسلمانوں میں اس کی کوئی زندہ مثال تو ہم پیش نہیں کر سکتے، لیکن اس کی خفیف سی جھلک ہندوستان (اور اب پاکستان) کے مسلمانوں کی گزشتہ پچاس ساٹھ سالہ زندگی کی تاریخ سے نظر آ سکتی ہے۔ یہ وہ خوش بخت خطہ ہے جس میں اقبال جیسے قرآنی دیدہ ور نے مسلمانوں کو اس فراموش شدہ حقیقت کی یاددہانی کرائی۔ اس یاددہانی کا اثر یہ ہوا کہ ملی تعلق کے سلسلہ میں یہاں کا مسلمان باقی دنیا کے مسلمانوں سے متمیز ہو گیا۔

---

[1] معاف فرمائیے۔ انسانوں کو کتوں سے تشبیہ دینے کی ہمت نہیں پڑتی، اس سے دل لرز جاتا ہے۔

یہاں کیفیت یہ پیدا ہو گئی کہ طرابلس کے میدانوں میں کسی بدو کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہے تو یہاں کے مسلمانوں پر رات کی نیند حرام ہو گئی۔ جنگ بلقان میں ان پر مصائب کا طوفان امنڈا تو یہاں کا مسلمان وقف اضطراب ہو گیا یونانیوں نے ترکوں پر یورش کی تو یہاں کا بچہ بچہ "غازی مصطفےٰ کمال پاشا وے بیر مایں دور بلائیاں" کی دلسوز دعائیں مانگنے لگ گیا۔ اور ۵۔ جون ۱۹۶۷ء کی صبح کو تو پاکستان کے طول و عرض میں، بوڑھے، بچے، جوان، مرد عورت، سب کی بعینہٖ وہی کیفیت تھی جو ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح ہم پر طاری ہوئی تھی — ذرا سوچئے کہ ہم میں اور مشرق وسطیٰ میں بسنے والے عربوں میں کون سا خون اور وطن کا رشتہ تھا جس کی بنا پر یہاں کا ایک ایک فرد ان کا شریک غم ہو گیا! یہ صرف اس فراموش کردہ سبق کی یاددہانی کا نتیجہ تھا جس نے یہاں کے مسلمانوں کے دل میں اس جذبہ کو بیدار کر رکھا ہے کہ — اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ — سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس قسم کے برادرانہ تعلقات، ایمان کے اشتراک کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔ اگر عربوں میں اسلام کا اشتراک، وحدت کی اساس بن جاتا، تو انہیں آج یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔

صدر ناصر کی دوسری غلطی یہ تھی کہ اس نے بھارت جیسے اسلام دشمن ملک کے ساتھ دوستداری کے تعلقات استوار کر لئے۔ اسلام، غیر مسلم اقوام سے معاہدانہ تعلقات پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ جتنے کہ نوع انسان کی بہبود کے کاموں میں وہ ان سے تعاون کی بھی تاکید کرتا ہے۔ لیکن وہ کسی غیر سے رشتہ مودت استوار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ دیکھئے! وہ اس باب میں کس قدر شدت سے تنبیہ کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

> اے جماعت مومنین! دیکھنا، تم اپنوں کے سوا دوسروں کے ساتھ کبھی رازدارانہ تعلقات استوار نہ کرنا، وہ تمہاری تباہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ (وہ ظاہرداری سے تمہارے دوست بن جاتے ہیں لیکن ان کی قلبی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ) تم پر کوئی مصیبت آئے تو وہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کے بغض وکینہ کی بعض باتیں بے اختیار ان کی زبان پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو آگ ان کے سینے میں دبی ہوتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔ . . . . کیا تم ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات قائم کرتے ہو جن کی کیفیت یہ ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا وہ دل وجان سے تمہارے ہم نوا ہیں، لیکن جب تم سے الگ ہٹتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ یاد رکھو! تمہاری خوشحالی اور خوش بختی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس کے عکس

تمہاری مصیبت اور بدحالی ان کے لئے وجہ ہزار شادمانی ہوتی ہے۔ (۳/۱۱۷-۱۱۸)

ایسے لوگوں سے دوستداری کے تعلقات وابستہ کرنا، خود فریبی کے سوا اور کیا ہے؟ برطانیہ ہو یا امریکہ[1]، اسرائیل ہو یا بھارت، یہ نہ تو کبھی مسلمانوں کے بہی خواہ ہو سکتے ہیں، اور نہ ہی اسے برداشت کر سکتے ہیں کہ مسلمان اقوام میں باہمی تعلقات خوشگوار ہوں۔ (مثلاً حالیہ جنگ میں مصر اور پاکستان جس قدر ایک دوسرے کے قریب آ گئے اس سے بھارت کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ نے اندر ہی اندر کیا رُخ اختیار کیا اس کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن اس کے جو شعلے بھڑک کر بے اختیار اوپر اُٹھ آئے ان کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگ کے متارکہ (CEASE - FIRE) کے بعد، وہاں کی وزیر اعظم (مسز اندرا گاندھی) نے سب سے پہلا پیغام جو صدر ناصر کو خطاب کر کے دیا (اور جو بھارت کے ریڈیو سے ۱۰-۱۱ جون کی درمیانی شب کو براڈکاسٹ ہوا) اس میں کہا گیا تھا کہ "نفرت اور عداوت کے بیج تو اسی دن بوئے گئے تھے جس دن وہاں اسرائیلی مملکت وجود میں آئی اور یہاں پاکستان نے اپنی جداگانہ ریاست قائم کی"۔ اس کے بعد کہا کہ جس طرح خارجی ممالک نے اسرائیلی مملکت کو مصر کے خلاف مدد دی ہے اسی طرح ۱۹۶۵ء کی جنگ میں، خارجی ممالک نے بھارت کے خلاف پاکستان کو مدد دی تھی۔ جو پوزیشن وہاں اسرائیل کی ہے وہی پوزیشن یہاں پاکستان کی ہے۔ لہٰذا، صدر ناصر کے لئے ضروری ہے کہ وہ پاکستان کی طرف سے بڑا محتاط رہے"۔ (۱۴-۱۵ جون کی درمیانی شب کو، آل انڈیا ریڈیو سے "خبروں پر تبصرہ" کے عنوان سے اس پیغام کو بڑی شد و مد سے دہرایا گیا اور اس میں مزید زہر چکانی کی گئی)

اور یہ وہی بھارت ہے جو جنگ کے دوران مسلسل چلاتا رہا کہ "ہم نہیں چاہتے کہ اسرائیلی مملکت کا وجود ختم ہو جائے۔" یہ صدر ناصر کے اس اعلان کے جواب میں تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ جب تک اسرائیل کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہم جنگ جاری رکھیں گے۔

۱۹۳۷ء میں جب تقسیم فلسطین کا سوال پہلی مرتبہ ابھرا ہے تو علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان (مورخہ ۲۷ جولائی) میں کہا تھا کہ "مسلمانوں کو اس فریب میں نہیں رہنا چاہیئے کہ یہ سوال یہودیوں کو بسانے کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی استعمار مسلمانوں کے وطن کے عین قلب میں خود اپنے لئے ایک اڈہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ اسی مقصد کے حصول کی تدبیر ہے"۔ اسی زمانے میں انہوں نے ضرب کلیم میں لکھا تھا کہ ؎

---

[1] اس وقت امریکہ ابھی نکھر کر سامنے نہیں آیا تھا۔

مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا

اس کے ساتھ ہی انہوں نے، فلسطین کے مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ؎

تری دوا نہ جنیوا[1] میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس نے ظاہر کر دیا، اور حالیہ جنگ نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی، کہ یہ مسئلہ نہ تو یہودیوں کو بسانے کا ہے اور نہ ہی یہ جنگ اسرائیلی مملکت کی تھی۔ یہ قصہ ہے اسلام کے خلاف، عیسائیت اور یہودیت کے متحدہ محاذ کا۔ لہٰذا، اس کا حل نہ تنہا مصر کے بس کا ہے اور نہ عرب نیشنلزم کے بس کا۔ اس کا حل صرف "اسلام" کی سطح پر سوچا اور تلاش کیا جا سکتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دنیا میں جتنی قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں انہیں ایک جگہ بیٹھ کر یہ سوچنا چاہیئے کہ وطن، رنگ، نسل، زبان، وغیرہ کے اختلاف کے باوجود، وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں، تو بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر ان میں کوئی وجہ اشتراک نہیں تو پھر ان کا یہ مشترک نام کیوں ہے؟ کیا دنیا میں کسی نے یہ تماشا بھی کبھی دیکھا ہے کہ دو چیزوں کا نام تو ایک ہو لیکن ان میں وجہ اشتراک کوئی نہ ہو۔ غور و فکر کے بعد، یہ قومیں اس کے سوا کسی اور نتیجہ پر نہیں پہنچ سکیں گی کہ ان میں وجہ اشتراک "اسلام" ہے۔ لیکن اسلام کے متعلق ہماری غلط فہمی یہ ہے کہ ہم نے اسے بھی دنیا کے دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب سمجھ رکھا ہے جس میں "عقائد و عبادات" میں تو اشتراک ہوتا ہے، سیاست میں اشتراک نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، اسلام ایک دین ہے جس میں سیاست، مذہب سے الگ ہوتی ہی نہیں۔ لہٰذا، اگر مسلمان کہلانے والوں میں وجہ اشتراک اسلام ہے تو ان میں سیاسی اشتراک بنیادی شرط ہے۔

سیاسی اشتراک کے معنی یہ ہیں کہ اسے ایک حقیقت کی طرح تسلیم کر لیا جائے کہ ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور غیر مسلموں کے ساتھ ان کے تعلقات اسی طرح استوار ہوں گے جس طرح ایک قوم کے تعلقات دوسری قوم سے استوار ہوتے ہیں۔ سردست، مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی مملکتوں کو بے شک الگ الگ رہنے دیا جائے لیکن ان کی حیثیت ایسی ہونی چاہیئے جس طرح ایک مملکت کے وفاقی نظام میں مختلف صوبوں کی حیثیت ہوتی ہے۔ اس وفاق کی مرکزیت ان تمام

---

[1] لیگ آف نیشنز۔

ممالک کے نمائندگان پر مشتمل کونسل چاہیئے۔ اور ڈیفنس اور خارجہ پالیسی اس مرکز کی تحویل میں رہنی چاہیئے۔ آپ کا جی چاہے تو اسے مسلم بلاک کہہ لیجئے۔ یہی تھی ضرورت جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں مسلمانانِ عالم کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ انہوں نے (اپنے محولہ بالا بیان میں) کہا تھا کہ:۔

> موجودہ وقت، ایشیا کی غیر عرب آزاد مسلم مملکتوں کے ارباب سیاست کے لئے لمحۂ فکریہ ہم پہنچاتا ہے۔ الغائے خلافت کے بعد یہ سب سے پہلا نازک ترین مسئلہ ہے جس کی نوعیت مذہبی بھی ہے، اور سیاسی بھی، اور تاریخی تقاضے جس کا مقابلہ کرنے کی دعوت (تمام ان ممالک کو) دیتے ہیں۔ یہ مملکتیں اس وقت اس ادارہ کی ممبر ہیں جسے کہا تو لیگ آف نیشنز جاتا ہے لیکن جو درحقیقت انگلینڈ اور فرانس کے گٹھ جوڑ سے زیادہ کچھ نہیں۔ فلسطین کا مسئلہ شاید ان (مسلم) اراکین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دے کہ انہیں کون سے عملی اقدامات کرنے چاہئیں جن سے اقوامِ مشرق کی ایک الگ لیگ قائم ہو جائے۔

تمام مسلمانوں پر مشتمل اُمتِ واحدہ کا یہی وہ تصور تھا جس کے متعلق انہوں نے اس سے بہت پہلے کہا تھا (اور بار بار کہا تھا) کہ:۔

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل، اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس ہلاک کے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہوگا کہ وہ قوم کے ہر جوان فرد کو عسکری تربیت (فوجی ٹریننگ) دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسرائیل نے بیس سال کے مختصر ترین عرصہ میں اس قدر فوجی طاقت کس طرح حاصل کر لی ہے۔ اس کے ہاں ہر جوان (لڑکے اور لڑکی) کے لئے فوجی تربیت حاصل کرنا لازمی ہے اسلام نے امتِ مسلمہ کے لئے یہی پروگرام تجویز کیا تھا۔ اس میں امت کا ہر فرد (سپاہی) مجاہد ہونا تھا۔

اور اس کے ساتھ ہی انہیں اس مقصد کے لئے بھی عملی اقدامات کرنے چاہئیں کہ ان ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی عام ہو۔ اس کے بغیر دنیا کی کوئی قوم ایک دن کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ حالیہ جنگ نے بھی اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ جوانوں کی (MAN - POWER) کی اس قدر اکثریت کے باوجود،

ان کی برق رفتار شکست کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی، کہ جنگ کی سائنٹیفک ٹیکنالوجی میں اسرائیل ان سے بہت آگے تھا۔ اس کی اہمیت کی طرف ہم شروع میں بھی توجہ دلا چکے ہیں۔

یہ ہے اس وقت سب سے پہلا کرنے کا کام، یعنی اسلامک آئیڈیالوجی (ایمان کے اشتراک کی بنا پر) مسلمانانِ عالم کی قومیت کی تشکیلِ جدید۔

صدر ناصر نے موجودہ مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے "عرب سربراہوں" کی کانفرنس تجویز کی ہے ضرورت ہے کہ اس کی جگہ "مسلم سربراہوں" کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ موجودہ عالمگیر خطرہ نے اس کے لئے فضا کو بڑا سازگار بنا دیا ہے۔ سوال اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کا ہے۔ اگر یہ آواز پاکستان کی طرف سے بلند ہو جائے، تو یہ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ چہ عجب! کہ اس کے صلہ میں مبدأ فیض کی طرف سے اسے شرفِ امامت بھی عطا ہو جائے۔

لیکن یہ صرف اس مسئلہ کے حل کے خارجی پہلو ہیں۔ اس کا اصلی حل داخلی ہے جسے قرآن نے قوموں کی موت و حیات کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ یعنی یہ کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۔ (۱۳)

جب تک کسی قوم کے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، اس کی حیاتِ اجتماعیہ میں تبدیلی واقعہ نہیں ہو سکتی — لہٰذا بنیادی کرنے کا کام مسلمانانِ عالم میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ ان کی موجودہ پستی اور زبوں حالی، ان کی ذہنیت کی پیدا کردہ ہے۔ اور اُن کی یہ ذہنیت پیدا کردہ ہے اُس خلافِ اسلام مذہب کی جو اسلام کے نام سے ان کے ہاں رائج ہے۔ اس مذہب نے ان کی عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا۔ علم و تحقیق کے دروازے ان پر بند کر دیئے۔ ہر نئی چیز (ایجادات) کو ان پر حرام قرار دے دیا۔ حاضر و موجود کو ان کی نگاہوں میں قابلِ نفرت قرار دے کر، انہیں (OTHER - WORLDLY) بنا دیا۔ (حالانکہ قرآن نے کہا یہ تھا کہ جس کی یہ دنیا نہیں سنورتی، اس کی آخرت کبھی نہیں سنور سکتی) جب تک عالمِ اسلام سے، اس خود ساختہ مذہب کو الگ نہیں کیا جائے گا، مسلمان زندہ قوموں کی صف میں آنے، اور حقائق کا مقابلہ کرنے کے قابل کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا، خارجی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ، ان کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ موجودہ مذہب کی جگہ، اس دین کو متشکل کیا جائے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اسی سے ان کے ہاں وہ معاشی نظام بھی رائج ہو سکے گا جو نظامِ سرمایہ داری کے جذام اور اشتراکی فلسفۂ حیات کے سرسام (دونوں) کا مقابلہ کر کے، نوعِ انسان کو صحیح انسانیت کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کو ایک ہی نظریہ بچا سکتا ہے، اور یہ بات ساری دنیا کے مسلمانوں کے متعلق کہی جا رہی ہے یعنی رجعت الی القرآن (BACK TO QURAN) کا نظریہ۔ اگر انہوں نے اسے اختیار کر لیا تو انہیں ہر قسم کی سرفرازیاں اور شادابیاں حاصل ہو جائینگی۔ اگر ایسا نہ کیا تو پھر کوئی تدبیر بھی انہیں زمانے کی یورشوں سے بچا نہیں سکے گی اور یہ کام بہت جلد کرنے کا ہے کیونکہ زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔

آخر میں ہم اپنے عرب بھائیوں کی خدمت میں عرض کرینگے کہ اس وقت آپ جن مصائب و آلام کا شکار ہو رہے ہیں، پاکستان میں کوئی قلبِ حساس ایسا نہیں جو اس سے وقفِ اضطراب، اور کوئی آنکھ ایسی نہیں جو مصروفِ خوننابہ فشانی نہ ہو۔ اس قیامتِ صغریٰ میں ہم سب آپ کے شریکِ غم ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ آپ ہم سے بھی زیادہ، اس حقیقت سے واقف ہونگے کہ میدانِ جنگ میں شکست سے کوئی قوم تباہ نہیں ہوتی۔ وہ تباہ ہوتی ہے ذہنیت کی شکست سے۔ اس باب میں قرآن کا پیغام یہ ہے کہ — تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ - (۳/۱۳۹)۔ حوادثِ روزگار کی کیفیت محض گردشِ دولابی کی سی ہے۔ اگر آج تمہیں شکست ہوئی ہے تو کل ہی کو تمہیں فتح و کامرانی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے شکست سے دل برداشتہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مصیبت کے وقت اس کا مداوا سوچنا چاہیئے۔ ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ جنگ کے بعد آپ کے ہاں جو ردِ عمل ہوا ہے اس سے یہ نظر آتا ہے کہ آپ نے ہمت نہیں ہاری۔ آپ کے عزم بدستور جواں ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آپ پھر اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو جائیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی گزارش کریں گے کہ آپ اس مسئلہ کا حل مقامی طور پر نہ سوچیں، اسلامی سطح پر سوچیں۔ مقامی طور پر یہ کبھی حل نہیں ہوگا اور اسلامی سطح پر اس کے حل ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ "امتِ احمدِ مرسل کو مقامی" کر کے ہم کافی پٹ چکے ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اس "مقامیت" کی لعنت کو مرکزیت سے بدل لیں۔ یاد رکھیئے !

مومنوں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے، خدائی

اگر حالیہ جنگ سے ہم اتنا سبق ہی سیکھ لیں تو یقین مانیئے مشرقِ وسطیٰ کی سرزمین پر بہنے والا عربوں کا خون ناحق رائگاں نہیں جائے گا، اور ہم اقوامِ عالم سے سر اٹھا کر کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ دیکھ لو کس طرح

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

اس سلسلہ میں چند باتیں خصوصی طور پر پاکستان سے بھی متعلق ہیں جن کا گوش گزار کرنا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ پاکستان پر ۱۹۶۵ء کے بھارتی حملہ اور حال ہی میں مصر پر اسرائیلی حملہ نے یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ اب کسی ملک پر مخالف ملک کی طرف سے، بلا اطلاع اور الٹی میٹم، کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے بنابریں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہر وقت "جنگ کی حالت" میں سمجھیں۔

۲۔ قریب بیس سال کا عرصہ ہوا، پاکستان، اسرائیل اور چین ایک ہی وقت میں منصہ شہود پر آئے۔ اس عرصہ کو ان تینوں ملکوں نے کس طرح استعمال کیا، اس کا اندازہ ان کی موجودہ حالت سے لگایا جا سکتا ہے اسرائیل کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہودی دنیا کی متمول ترین قوم ہیں۔ اس لئے ہم دولت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن چین تو دنیا کا غریب ترین ملک تھا۔ اس نے جو کچھ کیا اس کا بنیادی راز اس کے معاشی نظام کی تبدیلی میں ہے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ وہ نظام خود قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ اس لئے اسے اختیار کرنے سے ہم (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) قرن اول کے صحیح اسلام کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہمارے زندہ رہنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ ہم امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داری نظام کا مقابلہ سرمایہ داری نظام سے کر ہی نہیں سکتے۔

۳۔ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے ہیں۔ ہماری ساری توجہ اسی پر مرکوز ہو جانی چاہیئے۔

۴۔ قرآن کا عسکری نظام یہ تھا کہ ملت کا ہر فرد سپاہی ہو۔ اسرائیل اور چین، دونوں نے اپنے ہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ملٹری ٹریننگ لازمی قرار دے دی۔ اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اگر ہم نے اس میں مزید تغافل برتا تو اس نقصان کی تلافی کبھی نہیں ہو سکے گی۔

۵۔ ہماری قوم بے حد جذباتی واقعہ ہوئی ہے۔ اس کا خوشگوار پہلو تو یہ ہے کہ خطرہ کے وقت یہ بڑی سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا نقصان رساں گوشہ یہ ہے کہ یہ دوسروں کے پراپیگنڈہ کا بھی اسی تیزی سے شکار ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ قوم میں صحیح سیاسی شعور بیدار کیا جائے۔ عوام میں اس کا ذریعہ پریس ہے اور طلبا میں صحیح نظام تعلیم۔ اور ہم نے اس بیس سال میں ان دونوں ذرائع تربیت سے مجرمانہ تغافل برتا ہے۔ اگر ان کی طرف فوری توجہ نہ کی گئی، تو پھر ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔

۶۔ اسرائیل نے ایک مقصد کے حصول کے لئے مملکت قائم کی۔ چین کے پیش نظر اپنی مخصوص آئیڈیالوجی تھی۔ بیس برس میں ان کا ہر قدم اسی مقصد اور منزل کی طرف اٹھتا چلا گیا۔ اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے

ہے۔ ہم نے بھی ایک آئیڈیالوجی کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا۔ لیکن اس کے بعد وہ آئیڈیالوجی ہماری زبانوں تک رہ گئی ۔ جب تک اس آئیڈیالوجی کو مقصودِ مملکت قرار نہیں دیا جائے گا، ہم میں مقصد کی خاطر زندہ رہنے اور مقصد کی خاطر مرمٹنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہ آئیڈیالوجی قرآن میں بیان کردہ مستقل اقدار کے سوا کچھ نہیں ۔ جب تک پوری کی پوری قوم میں (اوپر کے طبقہ سمیت) اس مقصد کے لئے "جنون" پیدا نہیں ہو جاتا، ہم زندہ رہنے کے مستحق قرار نہیں پا سکتے۔

۷۔ ہم نے دین کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم ہونے کا دعوےٰ کیا اور اسی دعوے کی بنیادوں پر پاکستان حاصل کیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم ابھی تک ایک قوم بن ہی نہیں سکے۔ ہم یا افراد کی زندگی بسر کر رہے ہیں یا برادریوں اور علاقائی نسبتوں سے گروہوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ملک کا اجتماعی مفاد ہمارے سامنے ہی نہیں۔ ہر ایک اپنے مفاد کی دھن میں مصروف اور لوٹ میں مشغول ہے۔ یہ اوپر کے طبقہ کا حال ہے۔ باقی رہے عوام، سو وہ روٹی کی فکر میں اس قدر پریشان و سرگرداں ہیں کہ انہیں یہ کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ملک کیا ہوتا ہے اور قوم کسے کہتے ہیں۔ جب تک ریت کے ان بکھرے ہوئے ذروں کو محکم بنیاد پر چٹان نہیں بنایا جائے گا، یہ کسی طوفانِ بلا کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

۸۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ لیڈر طعنہ زن ہیں کہ قوم نکمی ہے۔ اور قوم شکوہ سنج ہے کہ لیڈر کام کے نہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ — وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً - (۸/۲۵) — اس تباہی سے ڈرو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جو ظلم و زیادتی کرنے تھے۔ وہ ساری کی ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ پھر نہ قوم کے ظالم بچا کرتے ہیں نہ مظلوم ۔

سیلاب نہ پُرسد کہ در خانہ کدام است!

۹۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے، ہر قوم کو مہلت کا وقفہ ملتا ہے اور اس کے ختم ہونے سے پہلے اسے ایک وارننگ ملتی ہے۔ اگر وہ اس سے سنبھل جاتے تو بہتر ورنہ اس پر تباہی بَغْتَةً (اچانک) آجایا کرتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسرائیلی قیامت خیزی ہمارے لئے آخری تباہی سے پہلے کی وارننگ ہے۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ — ! کیا کوئی ہے جو اس تنذیر سے نصیحت حاصل کرلے! وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ!

عشق کو فریاد لازم تھی، سو وہ بھی ہو چکی!

⁂

خورشید عالم

پھر دانت پیستی ہیں صلیبیں ہلال پر

۵ جون کو متحدہ عرب کمان کا ایک بیان نشر ہوا جس میں کہا گیا:

ہم ساری دنیا پر یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم تنہا ایک دشمن ـــ اسرائیل ـــ کے خلاف نہیں لڑ رہے بلکہ اس دشمن کو مغربی قوتوں کی فوجی طاقت کی کمک حاصل ہے:

اسی دن قاہرہ ریڈیو نے واشگاف اعلان کیا کہ برطانیہ اور امریکہ کے طیارہ بردار بحری جہاز اسرائیل کی ہوائی حفاظت بھی کر رہے ہیں اور اردن اور سینائی کے علاقوں میں عربوں کے خلاف لڑ بھی رہے ہیں۔ یہ انکشاف لندن اور واشنگٹن کے منفی طور پر غیر مبہم دعووں کے بعد ہوا۔ برطانیہ کا کہنا تھا کہ اس کی فوجوں کو سخت تاکید ہے کہ وہ مشرق وسطےٰ کی جنگ سے بالکل الگ تھلگ رہیں۔ واشنگٹن کا دعوےٰ تھا کہ وہ "خیال، قول اور فعل" میں غیر جانبدار ہے۔ اس منافقت کو بھانپنے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہر دو ممالک کے بیانات قبل از جنگ اس کا بھانڈا پھوڑنے کے لئے کافی ہیں۔ جونہی خلیج عقبہ پر عربوں نے اپنا جائز علاقائی حق جتایا، برطانیہ اور امریکہ آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے عربوں کا موقف سمجھنے کی مطلقاً کوشش نہیں کی، بلکہ فوری طور پر یہ اعلان کر دیا کہ خلیج مذکورہ پر عربوں کا حق ملکیت تو تسلیم کرنا ایک طرف رہا، الٹا اسے اقدام جنگ سمجھا جائے گا جس کا پوری طرح مقابلہ کیا جائے گا۔ چنانچہ دونوں کے جنگی بیڑے حرکت میں آ گئے اور بحیرہ روم کے انتہائی مشرق میں غاصب اسرائیل کے سواحل کے پرے وارد ہو گئے اس کے ساتھ ہی یہ تیاری شروع ہوئی کہ جنگی جہازوں کی حفاظت میں ایک جہاز خلیج عقبہ سے گزارا جائے۔ اور عرب مزاحم ہوں تو ان سے جنگ کر کے ناکہ بندی توڑی جائے۔ یورپی ذہنیت کے خناس نے دونوں کو یہ سوچنے نہیں دیا کہ ہر چند ان کے ہاتھوں بین الاقوامی سیاست میں لاقانونیت کا دور دورہ ہے پھر بھی ہر لاٹھی سے بھینس نہیں ہانکی جا سکتی۔ ایسا ہوتا تو فرانس نہ ہند چینی سے بے آبرو ہو کے نکلتا نہ الجزائر میں اسے عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑتا۔ فطرت کا فتویٰ بھی اگر وہی ہوتا جو پیر فرنگ کا فتویٰ ہے تو ویٹ نام میں امریکہ کے لئے ذلت

کے سامان اتنے وسیع پیمانے پر تہ ہوتے جتنے کہ ہر روز ہوتے ہیں۔ لیکن یورپ تاریخ کا گیسو سنوارنے کا روادار نہیں، اس کا منہ نوچنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ بغیر یہ جانے کہ تاریخ کے آئینہ میں وہ اپنا منہ ہی نوچ رہا ہے۔

خلیج عقبہ کے مسئلے پر جنگ کے اقدامات کرنا تو بجائے خود رہا، جنگ کی بات تک کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اصولی طور پر دیکھا جائے تو اسرائیل کے بارے میں قانون و دستور کا ذکر خارج از بحث ہے۔ اسرائیل یورپی سازش کا نتیجہ ہے۔ اس کا وجود سراسر خلافِ قانون ہے۔ اسے تسلیم کرنا قانون کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا قانون کا تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ اس خلافِ قانون وجود کو یک قلم ختم کر دیا جائے۔ عرب اور مسلمانانِ عالم اس اصولی موقف سے نہ ہٹے ہیں نہ ہٹیں گے۔ لیکن اگر بغرضِ استدلال اسے نظر انداز کر دیا جائے تو بھی خلیج عقبہ پر عربوں کا حقِ ملکیت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس خلیج کا منہ آبنائے تیران کہلاتا ہے اور تین میل سے کہیں کم چوڑا ہے۔ اس اعتبار سے یہ سمندر بین الاقوامی ضوابط کے مطابق متحدہ عرب جمہوریہ کا علاقائی سمندر ہے۔ اسرائیل پر اس کا حق کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ لے دے کے ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اسرائیل کی ایک بندرگاہ ایلات خلیج عقبہ کے کنارے واقع ہے لہٰذا اسرائیل کو بھی اس سے گزر کر اس بندرگاہ تک پہنچنے کا حق ہونا چاہیئے۔ اگر اسرائیل بذاتِ خود خلافِ قانون ہو تو ایلات کی بندرگاہ پر اس کا حق تسلیم کر کے اسے راستہ دینے کا کوئی قانونی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بغرضِ استدلال اس اصولی اعتراض کو سامنے نہ رکھا جائے تو بھی اسرائیل کو اس گزرگاہ سے راستہ ملنے کا جواز نہیں نکلتا۔ ایلات کی جو بندرگاہ اس کے قبضے میں ہے وہ اس حد سے باہر ہے جو اقوام متحدہ نے ۱۹۴۹ء میں اسرائیل کے لئے مقرر کی تھی۔ اس بندرگاہ پر قبضہ اس نے عربوں سے لڑائی بند ہو جانے کے کافی عرصہ بعد کیا۔ گویا اقوامِ متحدہ کے فیصلے کے مطابق ایلات پر اسرائیل کا قبضہ ناجائز ہے۔ اندریں حالات امریکہ اور برطانیہ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ اسرائیل کو ایلات تک راستہ ملنا چاہیئے؟ انہیں تو بلکہ اقوامِ متحدہ میں بیٹھ کر یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ اسرائیل اس بندرگاہ سے دستبردار ہو کر ان حدود میں محدود ہو جائے جو اقوامِ متحدہ نے اسرائیل کے لئے مقرر کی تھیں۔ یوں بھی ایلات کی بندرگاہ اسرائیل کے لئے ایسی ہی ضروری ہوتی تو اقوامِ متحدہ ۱۹۴۹ء میں یقیناً اسے اسرائیل کا آویزۂ گوش بنا دیتی۔ ایسا نہیں ہوا۔ یہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ عربوں نے یہ آبی راستہ پہلے دن سے ہی بند رکھا۔ آٹھ سال تک بند رہنے کے بعد یہ راستہ ۱۹۵۶ء میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت کے بعد اقوامِ متحدہ کی فوج کی موجودگی کی بدولت کھلا اور کھلا رہ گیا۔ آٹھ سال تک اسرائیل کے یورپی بانیوں اور مربیوں میں سے کسی نے بھی اس کے بند ہونے یا بند رہنے پر اعتراض نہیں کیا۔ عربوں کا یہ اقدام ان کے تردیک درست نہ ہوتا تو وہ اس کے خلاف عملی اقدام کرنے سے کبھی باز نہ رہتے۔ انہوں نے آٹھ سال تک اس حقیقت کو تسلیم کئے رکھا کہ خلیج عقبہ عربوں کی ملکیت ہے۔ اور اس پر اسرائیل کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اب عربوں نے اپنا پرانا حق

پھر سے بنایا تو امریکہ اور برطانیہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔

امریکہ اور برطانیہ کے جنگی اعلانات اور اقدامات سے اسرائیل کو شہ ملی۔ اسے یہ شبہ تو کبھی نہیں تھا کہ عالم عرب پر اسے مسلط کرنے اور کیے رکھنے والے عربوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔ لیکن اپنے سرپرستوں کی گرمیٔ مزاج دیکھ کر غاصبانِ فلسطین کے سینے تن گئے اور وہ عربوں پر چڑھ دوڑے۔ اسرائیل کی جارحیت اس قدر عریاں اور بے جواز ہے کہ اس آگ کو بھڑکانے والے بھی دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے اور انہیں بین الاقوامی میدان میں سرخروئی حاصل کرنے کے خیال سے عالم عرب کی اس جنگ میں اپنی غیر جانبداری کا دعوے باندھنا پڑا۔ ہر چند ان کے دکھانے کے دانت ہیں، کھانے کے نہیں۔ تاہم انہیں ان دانتوں کی بار بار نمائش کرنے کی ضرورت شدید طور پر محسوس ہوئی۔ امریکہ اور برطانیہ کو غیر جانبداری کا ایسا ہی خیال ہوتا تو وہ جنگ سے پہلے عربوں کے خلاف اشتعال انگیز حد تک جارحانہ باتیں اور اقدامات نہ کرتے۔ ان باتوں اور اقدامات کے بعد ان کے غیر جانبداری کے بلند بانگ سے بلند بانگ دعوے کو بھی کچھ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ قول و فعل میں جارحیت پسندی اور منافقانہ دعویٰ غیر جانبداری، دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، اور یہ تصویر وہ تاریخی اور بین الاقوامی سازش ہے جس کے کردار برطانیہ اور امریکہ تھے اور جس کا نتیجہ اسرائیل کا ناپاک وجود ہے۔ پہلے دجل و فریب سے یہ زہریلا پودا عرب کی زمین میں بویا گیا، پھر اسے پھلنے پھولنے کا موقع دیا گیا اور اس کے بعد سے اکاس بیل کی طرح نہالِ ملت اسلامیہ پر اس کی زندگی کا رس چوس لینے کے لئے ڈال دیا گیا۔

امریکہ اور برطانیہ نے فلسطین کے گوشت کو عربی پوست سے نوچ کر علیحدہ کیا تو روس بھی اس قصابی پر صاد کرنے آ دھمکا تھا۔ وہ اسرائیل کو تسلیم کر کے ہی مغربی طاقتوں کے مقابلے میں مشرق وسطےٰ میں موجود ہو سکتا تھا۔ بعد میں البتہ وہ کبھی کبھی اسرائیل کو آنکھیں دکھا دیتا رہا، اور عربوں کی دوستی کا دم بھرتا رہا۔ اس نے مقدہ عرب جمہوریہ اور شام کی خصوصیت سے وقتاً فوقتاً امداد کی اور عربوں کی حمایت کا کوئی ایسا موقع ضائع نہیں کیا جس سے عالم عرب میں، امریکہ اور برطانیہ کے مقابلے میں، اس کے قدم مضبوط تر ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں اس نے برطانیہ فرانس اور اسرائیل کی شرمناک جارحیت کی مذمت کر کے امریکہ کو ان تینوں حلیفوں کا ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ اب کے روس نے امریکہ اور برطانیہ کو عربوں کے خلاف جارحانہ گفتگو اور جنگی اقدامات کرتے دیکھا تو جنگی جہاز لے کر بحیرہ روم میں یہ اعلان کر کے پہنچ گیا کہ امریکہ اور برطانیہ نے اسرائیل کی امداد کی تو وہ اسی حساب سے عربوں کی امداد کرے گا۔ روس نے ایسی کوئی امداد عربوں کی نہیں کی۔ عربوں نے تکرار سے کہا کہ امریکہ اور برطانیہ کے طیارہ بردار جہاز ان کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے شواہد بھی پیش کئے۔ یہ کچھ سن کر روس خاموش رہا۔ اس نے نہ اس کی تردید کی نہ مذمت۔ جیسا کہ سوڈان میں روسی سفیر نے توجیہہ کی۔

روس عربوں کی جنگی مدد کرنے پر آجاتا تو عالمی جنگ شروع ہو جاتی۔ بات قابلِ فہم ہوتے ہوئے بھی اس کے اپنے ہی وعدے کے خلاف جاتی ہے۔ روس کی اس دشواری کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ اقوامِ متحدہ کے محاذ پر عربوں کی مؤثر امداد کر سکتا تھا۔ سلامتی کونسل میں اس کے اور امریکہ کے رویے میں کوئی خاص فرق دکھائی نہ دیا۔ دونوں نے مل کر فائر بندی کی قرارداد منظور کرائی۔ اور اس میں اسرائیل کی کھلی جارحیت کے خلاف ایک لفظ شامل نہ کیا۔ اس قرارداد کو دونوں نے مشرقِ وسطیٰ میں بحالیٔ امن کی کوشش قرار دیا اور دونوں نے فریقین پر دباؤ ڈال کے اُن سے اسے منظور کرایا۔ یہ جنگ بندی تو ہے بحالیٔ امن کی کوشش نہیں۔ کیونکہ جب تک فلسطین کا مسئلہ حل نہیں کیا جاتا۔ جنگ کا خطرہ بدستور موجود ہی نہیں رہے گا، دن بدن بڑھے گا بھی ——

قدرتی طور پر عربوں کا پہلا ردِ عمل جنگ جاری رکھنے کا تھا لیکن روس کی یقین دہانی پر انہوں نے جنگ بندی منظور کر لی۔ یہ یقین دہانی کیا تھی، اس کی تفصیل سامنے نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ روس نے عربوں کو یقین دلایا ہوگا کہ وہ اسرائیل کو عربی علاقوں پر قابض نہیں رہنے دے گا۔ اور ان کی وقتی پسپائی کو مستقل شکست نہیں بننے دے گا۔ روس اب بہر حال تلافیٔ مافات کرتا دکھائی دیتا ہے۔

امریکہ اور برطانیہ کی سازش کے متعلق وضاحت پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے ولدِ یورپ —— اسرائیل —— کو مشرقِ وسطیٰ پر مسلط ہی اس لئے کیا تھا کہ جو کام باپ سے ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، اسے بیٹا پورا کرے۔ اسرائیل کو ہر طرح تیار کر کے انہوں نے یہ صورت پیدا کر دی ہے کہ اب وہ عالمِ عرب میں حکم بن کر بیٹھ جائے۔ عربوں کو جس شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ وقتی بھی ہو سکتی تھی۔ جنگ جاری رکھنے کی صورت میں ہو سکتا تھا کہ مصر صورتِ حال کو قابو میں لے آتا۔ اور اپنے طور پر یا عرب حلیفوں کی مدد سے اسرائیل کو پیچھے دھکیل دیتا۔ ابھی مصر کی پوری فوج میدانِ جنگ میں نہیں آئی تھی۔ الجزائر کی فوج بھی مصر میں پہنچنا شروع ہوگئی تھی۔ اور اس نے پوری طرح مورچے نہیں سنبھالے تھے۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ عجلت میں تھے اور وہ دنیا کو باور کرا دینا چاہتے تھے کہ تنہا اسرائیل، چھوٹا ملک اور تھوڑی آبادی ہونے کے باوجود، تمام عرب ممالک سے زیادہ قوی ہے۔ عرب نہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ انہیں مقابلہ کرنا ہی چاہیے۔ برطانوی وزیرِ خارجہ نے جامے سے باہر ہو کر عربوں کو جنگ بندی منظور کر لینے کا یوں مشورہ دیا کہ تمام محاذوں پر اسرائیل کی بالادستی ہے، لہٰذہ جنگ بند کرنے میں خود عربوں کا فائدہ ہے۔ وہ قریباً یہاں تک کہنے پر آگیا کہ عرب اس کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں کہ اسرائیل کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور سلامتی کونسل کی قرارداد بلا چون وچرا قبول کر کے اپنی جان بچا لیں۔

عربوں کی جان بچانے کا دم بھر کے اعلانیہ کوشش ہوتی کہ عربوں کی رگِ جان اور مضبوطی سے پنجۂ یہود

میں آجاتے۔ ہرچند امریکہ اور برطانیہ نے سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد منظور کی تاہم انہوں نے اسرائیل کو کھلی چھٹی دیئے رکھی کہ وہ باؤلے کتے کی طرح عربوں کو کاٹتا پھرے۔ اسرائیل پر جنگ بند کرنے کے لئے نہ تو دباؤ ڈالا گیا اور نہ اس نے سلامتی کونسل کے کہنے پر جنگ بند کی۔ اس نے جب تک اپنا مقصد حاصل نہیں کر لیا وہ باز نہیں آیا۔ اقوام متحدہ اس کا منہ دیکھتی رہی اور امریکہ اور برطانیہ اس کو تھپکی دیتے رہے۔ کہنے کو اس نے اپنا مقصد پوری طرح حاصل کر لیا ہے اور اس پر تمام صیہونی اور مسیحی دنیا خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی ہے کیوں نہ ہو، صلیبی جنگوں کی شکست کا اب کہیں جا کر انتقام لیا جا سکا ہے۔ صحرائے سینا پر قبضہ کر کے اسرائیل نہر سویز کے مشرقی کنارے پر پہنچ گیا ہے اور شرم الشیخ پر تسلط جما کر آبنائے طیران کا مالک بن گیا ہے۔ جارحیت نے اسے اس قابل بنا دیا ہے کہ نہر سویز اور خلیج عقبہ دونوں میں سے زبردستی گزر سکے۔ اس نے لگے ہاتھوں اردن کے مغرب کا وہ فلسطینی حصہ بھی ہتیا لیا ہے جسے اردن نے ۱۹۴۸ء میں آزاد کرا لیا تھا۔ یہ علاقہ اس کی تحویل میں رہے تو وہ دیکھتے اردن کا رخ بدلنے اور اردن کو اس دریا کے پانی سے محروم کرنے کے دیرینہ خطرناک منصوبہ کو روبعمل لا سکے گا۔ یہی امریکہ اور برطانیہ کی خواہش اور کوشش رہی۔ گویا قیام اسرائیل کے نتائج اب پہلی بار سامنے آنے لگے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ نتائج کو بے اثر ہونے دینگے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اور برطانیہ کی چالیں کامیاب ہوئی ہیں اور عربوں کو بہت بڑی اور عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ صدر ناصر کا استعفےٰ دے دینا ظاہر کرتا ہے کہ عربوں پر اس شکست کا فوری اثر کیا ہوا یہ ردعمل اپنی جگہ، اہل مصر نے بالخصوص اور عربوں نے بالعموم صدر ناصر کی حمایت کر کے اور انہیں استعفےٰ واپس لینے پر مجبور کر کے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ شکست اتنی سنگین کیوں نہ ہو، وہ وقتی صورت حال ہے پیش آنے والے کئی مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے اور تقاضائے وقت یہ ہے کہ صورت حال کا جائزہ لے کے نئے مرحلے کے لئے تیاری کی جائے۔ عربوں کا ترکش اقدامات خالی نہیں ہو گیا۔ تیل ان کے پاس بہت بڑا حربہ ہے جسے استعمال کر کے وہ امریکہ اور برطانیہ کو مؤثر جواب دے سکتے ہیں۔ انہوں نے ان ممالک سے قطع تعلق بھی کر لیا ہے اور یہ فیصلہ بھی کر لیا ہے کہ اپنا تیل اپنے ہی دشمنوں کے ہاتھ نہیں بیچیں گے۔ عربوں کو روس اور چین سے فوری امداد بھی ملنے لگی ہے اور اس نقصان کی تلافی کی فوری صورت پیدا ہو گئی ہے جو انہیں اسرائیل کے ہاتھوں اٹھانا پڑا ہے۔ روس اس فرد گذاشت کی بھی تلافی کرنے پر مستعد نظر آتا ہے جو اس سے سلامتی کونسل میں خصومت سے سرزد ہوئی اور جس کا عربوں پر ناخوشگوار اثر پڑا۔ اسرائیل کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ سے نکل کر اس کے ہاتھ میں آجائے تاکہ وہ عربوں کو مجبور کرے کہ وہ علیحدہ علیحدہ اس کے حضور پیش ہوں۔ اور اسے تسلیم کر کے اپنی شکست کا بھی اعتراف کریں، اور اس سے امن و سلامتی کی بھیک بھی مانگیں۔ اس کے برعکس

روس اس کوشش میں ہے کہ معاملہ بدستور اقوامِ متحدہ میں رہے اور اقوام عالم اسرائیل کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیں۔ اُس نے اور اُس کے ساتھی اشتراکی ممالک نے اسرائیل سے تعلقات بھی منقطع کر لئے ہیں۔ روس جنرل اسمبلی کا ہنگامی اجلاس طلب کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یقیناً عربوں کے حق میں جائے گا۔ ہر چند یہودی اس ضد پر اڑے ہوئے ہیں کہ وہ مقبوضہ علاقے خالی نہیں کریں گے اور ان کے مغربی سرپرست پوری طرح اس کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ لیکن یہی کبر و نخوت ان کی مزعومہ فتح کو شکست میں اور عربوں کی شکست کو فتح میں بدلنے کی تمہید ہوگی اب زیادہ سے زیادہ ممالک عربوں کی تائید و حمایت پر آ گئے ہیں اور امریکہ اور برطانیہ کے لئے آسان نہیں رہا کہ وہ لوٹے ہوئے مال پر اسرائیل کا حق دوسری قوموں سے منوا سکیں۔

اس پس منظر میں عربی حلقوں میں کہا جانے لگا ہے کہ اسرائیل کے خلاف جنگ بند نہیں ہوئی بلکہ جنگ کا ایک دور ختم ہوا ہے۔ نئے دور کے تقاضے پورے کرنے کے لئے عرب ممالک کی مؤتمر کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے اور عالمی اسلامی مؤتمر کی بھی باتیں ہونے لگیں ہیں۔ عربوں کی شکست کا صدمہ اتنا شدید اور ہمہ گیر ہے کہ شکست کے اسباب و عوامل کو تفصیلی طور پر سمجھنے کے لئے وقت درکار ہوگا۔ البتہ شکست کی عمومی — اور اصولی — وجہ ناقابلِ فہم نہیں۔ سب سے بڑی وجہ عرب خود ہیں۔ وہ اسرائیل جیسے زندگی اور موت کے مسئلے پر عملاً کبھی اکٹھے نہیں ہو سکے۔ انہوں نے زبانی زبانی اور علیحدہ علیحدہ اسرائیل کے استیصال کے دعوے باندھے۔ وہ جب مل بیٹھے تو اس مقصد کے حصول کے لئے مشترکہ کمان کی تشکیل تک کی باتیں کر گئے۔ لیکن وہ اکٹھے بھی ہوتے تو ان کے دل آپس میں پھٹے رہے۔ یہ بڑی دلخراش حقیقت ہے۔ وہ فلسطین کے استخلاص کے لئے کوئی متفقہ لائحہ عمل نہیں بنا سکے۔ ہمسایہ عرب ممالک میں بغاوتیں کرانا ان کے نزدیک مقدم ہو گیا۔ یہ افسوسناک ہی نہیں شرمناک بھی ہے کہ یمن میں ایک ملک کی کثیر فوج کا ہجوم ہے اور وہ دوسرے ملک سے برسرِ پیکار ہے۔ ایسے عرب ممالک بھی ہیں جن کے آپس میں سفارتی تعلقات تک منقطع تھے۔ اسرائیلی جارحیت کے فوری خطرے کے پیشِ نظر یہ شگاف پُر کرنے کی عاجلانہ کوشش کی گئی، لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا۔ تعجب ہے کہ عرب لڑے تو مشترکہ کمان میں رہے تھے، لیکن جنگ بندی کی قرارداد منظور کرنے کا وقت آیا تو سب نے انفرادی فیصلے کئے اور عجب انتشار دیکھنے میں آیا۔ جب تک عرب قبائلی سطح سے بالاتر ہو کر خلوصِ دل سے ایک نہیں ہو جاتے وہ اس سازش کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو یورپ نے اسرائیل کی شکل میں ان کے خلاف کر رکھی ہے۔ تشتت و افتراق کی عربوں نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ یہ آخری قسط ہونی چاہیئے اور عربوں کو اتحاد کی قدر و قیمت اچھی طرح جان لینی چاہیئے۔ انہیں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ اسرائیل صرف ان کے خلاف ہی سازش نہیں، پورے عالمِ اسلامی کے خلاف سازش ہے۔ اسرائیل کی سازش ظفر علی خان کے اس مصرعہ کی تفسیر ہے جو اس مضمون کا عنوان ہے۔

پھر دانت پیستی ہیں صلیبیں ہلال پر" ــــ جب تک یہ دانت توڑ نہیں دیئے جائینگے، اسرائیل کے فتنے کی سرکوبی نہیں ہو سکے گی۔ عربوں کو یہ بھی یقین کر لینا چاہیئے کہ تمام عالمِ اسلامی اسرائیل کو ایک لعنت سمجھتا ہے اور اس کے استیصال کے لئے پوری طرح ان کے ساتھ ہے۔ ترکی اور ایران نے جس بے غرضی اور دلسوزی سے عربوں کا ساتھ دیا ہے، اس سے عربوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔

مسلمانانِ عالم کا اتحاد اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ قبرص، فلسطین اور کشمیر ان سب کے مشترکہ مسائل ہیں۔ اس اتحاد سے ہی اس سازش کے مؤثر مقابلے کا امکان پیدا ہوگا جو عربوں کے خلاف اقوامِ متحدہ میں ہوتی بلکہ ہوتی چلی آئی۔ پاکستان بھی اسی سازش کا شکار چلا آرہا ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے اس پہلو کو ہمیں خصوصیت سے نگاہ میں رکھنا چاہیئے جو خطرناک سے خطرناک تر ہوتا جا رہا ہے۔ امریکہ محض طاقت کے بل بوتے پر کوریا میں لڑنے پہنچ گیا تھا۔ اور ڈھٹائی اور دھاندلی سے اپنی فوج کو اقوامِ متحدہ کی فوج کا بلند بانگ نام دینے پر آ گیا تھا۔ یہی بلکہ اس سے بدتر صورت ویٹ نام میں ہے۔ چونکہ امریکہ نہیں چاہتا کہ ویٹ نام کے باشندے معیشت اور معاشرت کا ایک خاص انداز اختیار کریں، وہ فوجیں بھیجے چلا جا رہا ہے اور ویٹ نام کو ایسا بین الاقوامی مسئلہ بنائے چلا جا رہا ہے جس کا کوئی حل نہ ملے۔ اور جس پر تیسری عالمگیر جنگ چھڑنے کا دار و مدار ہو جائے۔ عربوں کو بھی فوجی طاقت سے ڈرایا گیا۔ اس فوجی طاقت کا ایک حد تک استعمال کیا گیا اور پھر اقوامِ متحدہ میں بیٹھ کر خود بخود ایک فیصلہ کر کے عربوں سے نوازا گیا۔ جب تک یہ بین الاقوامی ملی بھگت قائم ہے، عرب منتشر رہیں گے اور کوئی نتیجہ خیز اقدام نہیں کر سکیں گے اور اگر عرب ایسا نہیں کر سکیں گے تو دوسری چھوٹی قومیں بھی باری باری اس دھاندلی کا شکار ہوتی رہیں گی۔ اس عنصر کا مقابلہ کرنے کے لئے غیر یورپی سطح پر اتحاد کی ضرورت ہے۔ اس اتحاد کا ایک دائرہ عالمِ اسلامی ہے، دوسرا اور وسیع تر ایشیا، افریقہ اور جنوبی افریقہ کا اشتراک و تعاون ہے۔ یہ بہرحال "عالمی کردار" کے سلسلۂ مضامین کا موضوع ہے اور اس پر تفصیل سے گفتگو آئندہ ہوگی۔ انشاء اللہ! ــــ (۱۰ جون ۶۷ء)

"اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری"

کا پمفلٹ

چھپ گیا ہے۔ قیمت ۲۵ پیسے فی نسخہ۔ طلوع اسلام کی بزموں کو حسبِ معمول نصف قیمت پر دیا جائے گا۔ بزمیں اپنی فرمائشیں بہت جلد بھیجدیں ــــ کیونکہ پمفلٹ کی مانگ بہت زیادہ ہے!

ناظم ادارہ طلوع اسلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نذرِ عقیدت بحضورؐ

رحمۃ للعالمینؐ

جشنِ عید میلاد النبیؐ کے سلسلہ میں پرویز صاحب کی ایک تقریر!

برادرانِ عزیز! دنیا کی کسی قوم کو لیجئے اس نے سال میں کچھ دن ایسے تجویز کر رکھے ہوں گے جنہیں وہ بطور قومی تیوہار منائے گی۔ قومی زندگی میں تیوہاروں کی تقریبات ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ تیوہار درحقیقت کسی قوم کے اجتماعی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور اظہارِ جذبات (بشرطیکہ وہ آئین و ضوابط اور سنجیدگی و شرافت کی حدود سے تجاوز نہ کرے) انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے نہایت ضروری ہے۔

تیوہار عام طور پر کسی اہم واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ جس واقعہ کی یاد میں کوئی قوم اپنا تیوہار مناتی ہے اس سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے نزدیک زندگی کے مختلف عناصر کی اہمیت کا معیار کیا ہے --- مثلاً ہندوستان کی ابتدائی آریہ قوم زراعت پیشہ تھی۔ اس لئے انہوں نے جہاں گنگا جمنا جیسے دریاؤں، بڑ اور پیپل جیسے درختوں کو اپنا دیوتا اور زمین (دھرتی) کو ماتا بنایا وہاں موسموں کے تغیرات کے اوقات (بسنت۔ ہولی وغیرہ) کو قومی تیوہار قرار دے لیا۔ اسلامی زندگی میں سب سے بلند اور عظیم مقام قرآن کریم کو حاصل ہے۔ اس لئے ان کے ہاں نزولِ قرآن سے زیادہ اہم واقعہ اور کون سا ہو سکتا تھا جسے ملی تیوہار کی حیثیت حاصل ہوتی۔ اس ضمن میں خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (۱۰/۵۸) "ان سے کہہ دو کہ (قرآن کا ملنا) اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے۔ انہیں چاہیئے کہ اس پر خوشیاں منائیں۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔"

لیکن قرآن کے بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) اور نظری قوانین (THEORETICAL LAWS)

قرآن اور صاحب قرآن کا تعلق

کو ایک جیتے جاگتے عملی نظام کی تشکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے پیش کیا۔ اس لئے نزولِ قرآن کی یاد منانے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی حیاتِ طیبہ کو بھی سامنے لایا جائے جس نے قرآنی حقائق کو محسوس پیکر میں متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ یہ نظام کس قدر ممکن العمل ہے اور اس کے نتائج نوعِ انسانی کے حق میں کس قدر حیات بخش اور انسانیت ساز ہیں۔ ہمارے ہاں اس حقیقتِ کبریٰ کی یاد تازہ کرنے کے لئے حضورؐ کے یومِ پیدائش کو بطورِ جشنِ مسرت (ملی تہوار) منایا جاتا ہے جسے عام طور پر عید میلاد النبیؐ کہا جاتا ہے۔ یہ تقریب حضورؐ کے یوم پیدائش سے متعین ہوتی یا یومِ وفات سے۔ واقعۂ ہجرت کی یاد میں ہوتی یا تکمیلِ دین کے اعلان کی مناسبت سے۔ میرے نزدیک اس سے اصل حقیقت پر کچھ فرق نہ پڑتا۔ یہ پڑ سکتا ہے مقصود و مطلوب بہرحال، قرآنی حقائق کی روشنی میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کو دنیا کی نگاہوں کے سامنے لانا ہے۔ اگر ہم اس مقصد کے لئے اس تقریب سعید کو مناتے اور اس انداز و اسلوب سے آپ کی سیرتِ مقدسہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتے، تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اگر ہم اب بھی اس تقریب کو اس انداز سے منائیں اور دنیا کے سامنے خالص قرآن کی تعلیم اور اس کی روشنی میں حضورؐ کی سیرت کو پیش کریں، تو میں علیٰ وجہ البصیرت دل کے پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ پوری نوعِ انسانی اس تقریب کو منانے لگ جائے۔ اس لئے کہ میرے گھر

آفتاب عالمتاب

کا دیا، میرے صحنِ خانہ کو روشن کرتا ہے اس لئے وہ صرف میرا دیا کہلاتا ہے۔ لیکن سورج ساری دنیا کو روشن کرتا ہے اس لئے وہ پورے عالمِ انسانیت کا مشترکہ چراغ ہوتا ہے۔ کسی خاص فرد، خاندان، قبیلہ، قوم یا ملک کا سورج نہیں ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ۔ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ (۳۳/۴۵) (اے نبیؐ!) ہم نے تمہیں (تمام اقوامِ عالم کے اعمال کا) نگران، زندگی کی صحیح روش پر چلنے کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دینے والا اور غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ نیز خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کو خدا کی طرف بلانے والا اور دنیا کو روشن کرنے والا سورج۔"

نبی اکرمؐ سے پہلے حضرات انبیاء کرام مختلف قوموں کی طرف آتے تھے (اس لئے کہ اسوقت ابھی انسان کی نگاہ اتنی وسیع اور اس کا ذہن اتنا بلند نہیں ہوا تھا کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی عالمگیر برادری کے تصور کو اپنا سکتا)۔ لیکن آپؐ کا ظہور تمام عالمِ انسانیت کیلئے تھا اور خدا کے آخری نبی کو ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا) اس لئے قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا۔ (۳۴/۲۸)۔" اور ہم نے

ساری دنیا کیلئے رسُول

تجھے تمام نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اس کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی کہ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (۷/۱۵۸) "عالمِ انسانیت کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ اسی سلسلہ تقریر کی ایک درخشندہ کڑی وہ آیۂ جلیلہ بھی ہے جو آج کے موضوع کا عنوان ہے۔ یعنی

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ (۲۱/۱۰۷)

اور ہم نے تجھے تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اسلام کا خدا "رَبُّ الْعَالَمِينَ"۔ (۱/۱) اس کا ضابطۂ قوانین (قرآن) "ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ"۔ (۳۸/۸۷) اور اس کا رسول "رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِينَ"۔ (۲۱/۱۰۷) اس میں رنگ، نسل، خون، زبان، وطن کی کوئی تخصیص و تمیز نہیں۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ایک غیر مسلم یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اپنے رسول کے متعلق اپنی ذات کے لئے جو عقیدہ چاہیں رکھیں۔ لیکن آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ غیر مسلم اقوامِ عالم کے لئے بھی رحمت ہیں؟ یہ سوال غور طلب ہے اور آج کی نشست میں اسی کا جواب میرے پیشِ نظر ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس موضوع کی طرف آؤں، یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ "رَحْمَةٌ" کے معنی کیا ہیں۔

رحمت کے معنی

عام طور پر رحمت اور رحم کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے۔ اور اس اعتبار سے رحمۃ کا ترجمہ بھی رحم ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی (MERCY) چنانچہ آپ قرآن کریم کے انگریزی تراجم میں اس لفظ کا ترجمہ (MERCY) ہی دیکھیں گے۔ لیکن اس سے اس لفظ کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آ سکتا۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے لفظ رحم کو سامنے لائیے جس میں جنین (بچے) کی نشوونما ہوتی ہے۔ لہٰذا رحمۃ کے معنی ہوتے ہیں سامان پرورش یا وہ قالب (PATTERN) جس کے اندر کسی کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔ اس میں نرمی اور ملائمت کا پہلو شامل ہوتا ہے۔ بنا بریں، آیت زیرِ نظر کے معنی یہ ہوں گے کہ اقوامِ عالم کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما (DEVELOP-MENT) اسی قالب (PATTERN) میں ہو سکتی ہے جسے نبی اکرمؐ نے پیش کیا۔ اسی سے افرادِ انسانیہ کو وہ سامانِ زیست و ارتقا مل سکتا ہے جس سے ان کی دبی ہوئی، خوابیدہ، صلاحیتیں ابھر کر توانائی حاصل کر لیں۔ قرآن نے رحمۃ کے اس مفہوم کو ایک مثال کے ذریعے خود واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُ۔ (۴۲/۲۸) "اور وہی ہے جو مایوسیوں کے بعد بارش برساتا ہے اور (اس طرح) اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے"۔ بارش کیا کرتی ہے؟ زمین مردہ کو زندگی عطا کرتی ہے۔ اس کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو نشوونما دیتی ہے۔ اسی کو قرآن رحمۃ سے تعبیر کرتا ہے۔

اس مثال میں قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (سامانِ نشوونما) کو انتہائی مایوسیوں کے عالم میں بھیجتا ہے۔

ظہورِ قدسی کے وقت دنیا کی حالت

سوال یہ ہے کہ جب حضور رحمت للعالمین کا ظہور ہوا، تو دنیا کا نقشہ کیا تھا؟ کیا

وہ بہار آفریں امیدوں اور مسرتوں کا گہوارہ تھی یا افسردگی خیز مایوسیوں اور نامرادیوں کا حسرت کدہ! اس کے متعلق ہم سے نہیں بلکہ ایک غیر مسلم مورخ کی زبان سے سنیئے (میں نے شروع میں کہا ہے کہ ایک غیر مسلم یہ سوال کر سکتا ہے کہ نبی اکرم کا ظہور، غیر مسلم اقوام عالم کے لئے کس طرح آیۂ رحمت تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے جواب میں جو کچھ کہا جائے غیر مسلموں کی شہادات سے کہا جائے تاکہ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت نکھر کر سامنے آجائے) تہذیب کے مورخ ڈینی سن (DENISON) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (EMOTION AS THE BASIS OF CIVILISATION -) اس مصنف کی شہرت اور اس کی تصنیف کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک طرف وائٹ ہیڈ (WHITEHEAD) جیسا بین الاقوامی پایہ کا مفکر اپنی کتابوں میں اسے (QUOTE) کرتا ہے اور دوسری طرف علامہ اقبالؒ جیسا حکیم الامت اس کا اقتباس اپنے خطبات میں دیتا ہے۔ یہ مورخ ظہور نبویؐ کے زمانہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

> اُس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جس کی تعمیر پہ چار ہزار سال صرف ہوئے تھے منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوعِ انسانی پھر اُسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ قدیم قبائلی آئین و مسالک اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے پرانے طرق و انداز کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن قواعد و ضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور بربادی و ہلاکت کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ ۔ سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جنگ و جدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یکجا کھڑے تھے اور جن کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔
>
> کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا۔ جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا۔ اسلئے کہ پرانی رسومات و آئین سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور قوانین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

اس سوال کا جواب وہ خود ہی ان الفاظ میں دیتا ہے۔

یہ امر موجب حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا۔ اور اس وقت پیدا ہوا جب اس کی اشد ضرورت تھی۔

یہ نیا کلچر (اسلام) کس قسم کا انقلاب لایا، اس کے متعلق کارلائل اپنی مشہور تصنیف (HEROES AND HERO WORSHIP.) میں لکھتا ہے:۔

عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعے پہلی مرتبہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی اُن کی طرف ایک رسول آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔

وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہو گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چلے ہیں کہ یہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی سے کرۂ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں۔ یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

وہ عرب ــــ یہ محمدؐ ــــ اور صرف ایک سو سال کا عرصہ!

کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی آگرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادہ میں تبدیل ہو کر بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے۔

نوعِ انسانی خشک نیستان کی طرح ایک شرارے کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

یہ تو اس سرزمین میں ہوا جو اس "جدید کلچر" کا اولین گہوارہ تھا۔ اور اس قوم کے لئے ہوا جس نے اس "کلچر" کو سب سے پہلے محسوس پیکر (قرآنی نظام) میں متشکل کیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ "کلچر" باقی دنیا کے لئے کس طرح حیات آفریں ثابت ہوا اور اس سے نوعِ انسانی کی دبی ہوئی صلاحیتوں نے کس طرح نشو ونما پائی۔

قرآن نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷)، وہ ان تمام بوجھوں کو اتارے گا جن کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی اور ان تمام زنجیروں کو توڑ کر پھینک دے گا جن میں افراد انسانیہ جکڑے ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے بوجھ تھے جن کے نیچے انسانیت دبی ہوئی تھی اور وہ کون سی زنجیریں تھیں،

حریتِ بخشِ نبوت

جن میں ان کا بند بند جکڑا ہوا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی طول طویل ہے لیکن اگر اسے مختصراً دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ بوجھ اور زنجیریں اربابِ قوت و اقتدار کا استبداد تھا جس نے انسانیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس استبداد کی نوعیتیں مختلف تھیں لیکن قرآن نے اسے تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ استبداد کی نوعیت کچھ بھی کیوں نہ ہو، وہ اصل کے اعتبار سے ان تین شقوں میں سے کسی ایک سے متعلق ہوگا۔ ان شقوں کو اس نے داستان بنی اسرائیل میں یک جا بیان کر دیا ہے۔ یعنی ملوکیت کا استبداد جس کا نمائندہ فرعون تھا — پیشوائیت (PRIESTCRAFT) کا استبداد جس کی زنجیریں جسم کو نہیں بلکہ انسان کے قلب و دماغ کو جکڑ لیتی ہیں۔ اس کا ترجمان ہامان تھا — اور سرمایہ پرستی کا استبداد جو شیروں کو لاڑی بنا دیتا ہے — اس کا مجسمہ قارون تھا۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ ہر جگہ یہی نظر آئے گا کہ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری نے اپنے گٹھ جوڑ سے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ ملوکیت، انسان کی طبعی آزادی کو سلب کرتی ہے۔ پیشوائیت اس کی فکری صلاحیتوں کو تباہ کرتی اور سرمایہ داری اس کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کرتی ہے — یہی تھیں: استبداد کی وہ زنجیریں اور توہم پرستی کی برف کی سلیں جنہیں اس نظام نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جسے قرآنی اصولوں کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے قائم کیا۔ یہی نظام وہ رحمت (PATTERN) ہے جس کے اندر نوعِ انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔

تین زنجیریں

ملوکیت کا استبداد

ملوکیت کے استبداد کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ حکومت یا اطاعت قانون کی ہوگی نہ کہ اشخاص کی۔ اور جہاں تک قانون کا تعلق ہے اس کے غیر متبدل اصول و حدود خود خدا کے مقرر کردہ ہیں، کسی انسان کو اختیار نہیں، کہ وہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل یا حک و اضافہ کر سکے۔ ان اصولوں کی روشنی میں، انسانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ اس مشاورت میں ساری امت اپنے نمائندگان کی وساطت سے شریک ہوگی۔ ان نمائندگان کے انتخاب میں معیار قلب و دماغ کی صلاحیت ہوگا، نہ کہ حسب نسب یا دولت و حشمت۔

پیشوائیت کا استبداد

پیشوائیت کے استبداد کا خاتمہ یہ کہہ کر دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں۔ کوئی وسیلہ اور واسطہ نہیں۔ اطاعت خدا کے اس قانون کی ہوگی جو اس نے اپنے رسول کی وساطت سے قرآنِ کریم کے اندر نوعِ انسانی کو دیا۔ اور یہ اطاعت ہوگی اس نظام کے توسط سے جو اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ اس قانون و نظام کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جائیگی۔ اور کسی سے کوئی عقیدہ یا نظریہ زبردستی نہیں منوایا جائے گا۔

اس نے صرف پیشوائیت ہی کو ختم نہیں کیا بلکہ خود سلسلۂ نبوت کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ نوعِ انسان کی راہنمائی

کے لئے جس قدر اصولی تعلیم کی ضرورت تھی اسے مکمل شکل میں دے کر (قرآن کی دفتین میں) ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اب انسان، ان اصولوں کی روشنی میں، زندگی کے بدلنے والے تقاضوں کا حل اپنے علم و بصیرت کی رُو سے خود تلاش کرے۔ اب بچہ جوان ہو گیا ہے۔ اب اسے کسی اُنگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے سامنے قرآن کے اصول اور ان کی عملی شکل اس نظام کا نقشہ ہے جسے محمد رسول اللہ والذین معہ نے قائم کیا تھا۔ اس کے بعد اب کسی آنے والے کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ جسے آنا تھا وہ آخری بار ساری دنیا کے لئے بشیر و نذیر بن کر آ گیا۔

علامہ اقبال ؒ کے الفاظ میں۔

> اس نقطۂ خیال سے دیکھئے تو پیغمبر اسلام، دنیائے قدیم و جدید کے درمیان بطور حدِ فاصل کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کی روح کیا ہے تو آپ کی ذاتِ گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پا لیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کے لئے ضرورت تھی، اسلام کا ظہور، استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہدِ طفولیت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن کریم غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علمِ انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے۔ (خطبات)

جہاں تک توہم پرستیوں کا تعلق تھا، اس نے ان کا خاتمہ یہ کہہ کر کر دیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، انسان کے لئے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے۔ "یہ وہ ملائکہ ہیں جو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں"۔ لہٰذا انسان کا مظاہرِ فطرت میں سے کسی کے سامنے جھکنا یا کسی سے ڈرنا تذلیلِ آدمیت اور تحقیرِ شرفِ انسانیت ہے۔ انسان کو قوانینِ الٰہیہ کے آستانۂ عالیہ پر جھک کر، دنیا کی چوکھٹ سے بے نیاز سرفرازانہ انداز سے آگے بڑھ جانا چاہیئے۔

غلامی کا خاتمہ

اس نے غلامی کا یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا کہ خدا نے ہر انسان کو محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے۔ اسلئے کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے۔ باقی رہے مدارج، سو ان کا معیار سیرت و کردار کی بلندی اور فرائض شناسی و حسن کارکردگی ہے اور یہ میدان تمام افرادِ انسانیہ کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ ؎

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا ؛ قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

اس نے انسان اور انسان میں غلط معیاروں کے مطابق تفریق و تقسیم کو کسی خاص معاشرہ، خاص قوم، خاص خطۂ زمین ہی میں نہیں مٹایا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ تمام اقوامِ عالم اصل کے اعتبار سے ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ لہٰذا، رنگ، نسل، خون، زبان، وطن کے خود ساختہ معیاروں کے مطابق نوعِ انسان کو قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کر دینا اور پھر ایک قوم کا دوسری قوم کے مقابلہ میں محاذ قائم کر لینا، اور یوں اس جنتِ ارضی کو درندوں کا بھٹ بنا لینا، انسانیت نہیں، سبعیت و بہیمیت ہے۔ انسانوں میں تفریق و تقسیم کا معیار صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ انسانیت کے بلند نصب العین حیات پر یقین رکھیں وہ ایک برادری کے فرد ہیں، اور ذاتی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ کر اس عالمگیر برادری کے تصور کی مخالفت کریں۔ دوسری قوم کے افراد، بالفاظِ دیگر قومیت کا معیار آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے۔ نہ کہ نسل اور وطن کا اشتراک۔

سرمایہ پرستی کا خاتمہ

سرمایہ پرستی کے قارونی استبداد کو اس نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ذرائع رزق اور وسائل پیداوار (ارضی) کو تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ انہیں ذاتی ملکیت سمجھ کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے۔ جہاں تک دولت کا تعلق ہے، ضرورت سے زاید دولت کسی شخص کے پاس نہیں رہنی چاہیئے۔ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ (نظام) پر ہونی چاہیئے۔ جو معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا اسے حق نہیں کہ وہ نظام کو اپنے ہاتھ میں رکھے۔ انسانی آزادی کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ کوئی فرد، اپنی کسی ضرورت کے لئے، کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس!

یہ تھیں انسانی استبداد کی وہ زنجیریں جنہیں ایک ایک کر کے توڑا گیا۔ لیکن اس استبداد کا ایک گوشہ ایسا ہے جو ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ دنیا میں مردوں نے ایک افسانہ تراشا کہ "آدم کو جنت سے نکلوانے کا باعث اس کی بیوی تھی"۔

عورت پر استبداد

اور اس کے بعد یہ فتوے صادر کر دیا کہ تمام فتنے اور فساد کی جڑ عورت ہے، اس لئے اس پر جس قدر سختی کی جائے کم ہے۔ آپ تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ ظہورِ نبوتؐ سے پہلے دنیا میں عورت کی حالت کیا تھی۔ اس حالت پر غور کیجئے اور پھر اس اعلانِ عظیم کو دیکھئے کہ پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت کی حیثیت یکساں ہے اور فطری فرائض کے اعتبار سے اگر مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے تو ویسی ہی فضیلت عورت کو مرد پر بھی حاصل ہے۔ فتنہ و فساد کا سرچشمہ نہ عورت ہے نہ مرد۔ دونوں میں لغزش کا امکان، اور استقامت کی صلاحیت موجود ہے۔

یہ ہیں برادرانِ عزیز! وہ چند اہم اصول جن کی بنیادوں پر نبی اکرمؐ نے ایک ایسا معاشرہ استوار کیا جس نے ہر نظامِ کہن

کی بساط اُلٹ کر، استبداد کی ہر اُس زنجیر کو توڑ دیا جو انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے راستے میں آہنی دیوار بن کر حائل تھی۔ قرآن نے اس تمام داستان کو چند الفاظ میں اس حسن و خوبی سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو روح وجد میں آجاتی ہے۔ آپ ان آیات کو سامنے لائیے جن میں نبی اکرمؐ کو رحمۃ للعالمین کہہ کر پکارا گیا ہے

وراثت ارض کا محکم اصول

اور پھر دیکھئے کہ قرآن نے اس حقیقت کبریٰ کی کس حسین و جمیل انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ قبل اس کے کہ ان آیات کو سامنے لایا جائے،

آپ ایک مرتبہ پھر اس داستان کہن کو دہرا لیجئے کہ حضورؐ کے ظہور قدسی سے پہلے دنیا کا نظام کیا تھا؟ نظام یہ تھا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ جس نے کسی طرح قوت حاصل کرلی، اقتدار کی مسندوں پر قابض ہوگیا۔ اور پھر یہ قبضہ واختیار یہ سطوت و اقتدار، اس کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتا چلا گیا۔ اس میں نہ استعداد و قابلیت کا کوئی سوال تھا، نہ صلاحیت کی کوئی شرط، اس پس منظر میں دیکھئے کہ وہ نظام جسے اس رحمۃ للعالمینؐ کے مقدس ہاتھوں نے متشکل فرمایا، اس کا اصل الاصول کیا تھا؟ فرمایا۔ وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ ہم نے ہر آسمانی کتاب میں اخلاقی اقدار و ضوابط بیان کرنے کے بعد لکھ دیا تھا اور اب اس بنیادی حقیقت کو قرآن میں دہراتے ہیں) کہ زمین کا نظم و نسق صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے جن میں اس کی صلاحیت ہو۔ (صلاحیت میں قلب و دماغ دونوں کی صلاحیت آجاتی ہے) آپ غور کیجئے برادران! کہ قرآن نے اس مختصر سے ٹکڑے میں کتنے بڑے انقلاب کا اعلان کیا ہے جس سے نظم و نسق اور اقتدار و اختیار کے تمام سابق معیار اُلٹ کر ان کی جگہ صرف صلاحیت نے لے لی ہے۔ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۔ اس انقلاب آفریں اصول میں، اس قوم کے لئے جو قوانین الٰہیہ کی محکومی اختیار کرے، ایک بڑی دور رس حقیقت پوشیدہ ہے۔ اور اس کے بعد ہے۔

وَ مَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (۲۱/۱۰۷)

"یوں، اے رسولؐ! تمہاری بعثت تمام اقوام عالم کے لئے وہ قالب، وہ فریم، وہ (PATTERN) بن جاتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔

آپ نے حضور رحمۃ للعالمین کی بعثت سے پہلے کی ہزاروں سال کی تاریخ انسانیت کو دیکھا۔ اس کے بعد آپ اس ظہور قدسی کے بعد کی چودہ سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ زندگی کے وہ اصول جنہیں قرآن نے عطا کیا، اور جن کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے ایک نظام جدید کی بنیاد ڈالی، کس طرح وہ قالب بن گئے جن کے اندر نوع انسانی کی دبی ہوئی صلاحیتوں نے انگڑائی لے کر آنکھ کھولی۔ اور پھر یہ سبزہ نورستہ دیکھتے ہی دیکھتے شادابیوں اور شگفتگیوں کا لالہ زار بن گیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ورنہ میں مغرب کے غیر مسلم مفکرین، مصنفین اور مؤرخین کے سینکڑوں

آراء و اقوال پیش کرتا جن میں انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین ؐ کا ظہور نہ ہوتا تو اس خاکدان کی رنگینیاں اور رعنائیاں کبھی اس ہجوم و وفور سے تبسم ریز و کیف بار نہ ہوتیں۔ اس وقت میں آپ کے سامنے (BRIFF-AULT) کی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY.) کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ دیکھئے کہ یہ نامور مؤرخ اس حقیقت کا اعتراف کن الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

اسلام کا احسان یورپ پر

> یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرہویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا۔ یورپ کی خلعتِ جدید کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اندلس ہے۔ ادھر روما کی تہذیب گرتے گرتے بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور ادھر مسلمانوں کی اسلامی تہذیب و ذہنی تحریکات کی مرکز بن رہی تھی۔ انہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقا میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی دنیا حیاتِ نو سے آشنا ہوئی ..... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود ہی عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ ویسے تو مغربی کلچر میں کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصر حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء۔ سائنس کی روح۔ ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہینِ منت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کرایا۔ نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کا زمانہ، درحقیقت زمانۂ قبل از سائنس (PRE - SCIENTIFIC) تھا۔ پندرہویں صدی تک یورپ انہی علوم و فنون کو اپناتا رہا، جو اسے مسلمانوں نے دیئے تھے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ جب اندلس میں تہذیب و ثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ "جن" نمودار ہوا جسے اندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی صرف سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اس کی حرارت کا موجب بنے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمو نظر آتی ہے، یہ صدقہ ہے اُس "رحمت" کا جسے تمام اقوامِ عالم کے لئے عام کر دیا گیا تھا۔ دنیا قرآنی اصولوں اور اس کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ مستقبل میں جا کر اپنائے گی۔ اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشوونما اور ارتقاء کی آخری حد تک پہنچ سکتی ہیں، نہ حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا بزمِ ہستی میں جہاں کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتاب عالمتاب کی ضیا باریوں کا صدقہ ہے اور گلشنِ عالم میں

جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جانِ بہار کی نکہت باریوں کا رہینِ منت ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

میں نے جو کچھ ابھی ابھی کہا ہے وہ محض ہماری عقیدت کا اظہار نہیں۔ وہ ایک واقعہ ہے جو ہر اُس آنکھ کے سامنے بے نقاب آ سکتا ہے جس پر تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو۔ میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ آپ کے سامنے (LAMARTINE) کی مشہور تصنیف (HISTORE DE LA TURQUE) کا ایک اقتباس پیش کروں۔ اقتباس طویل ضرور ہے، لیکن حضور رحمت للعالمینؐ کی شانِ اقدس میں ایک غیر مسلم کی زبان سے، اس سے بہتر نعت کم از کم میری نظروں سے نہیں گذری۔ سنئے اور اس شہادت میں میرے ہمنوا ہو جائیے۔ وہ لکھتا ہے۔

دنیا میں کسی انسان نے برضا و رغبت یا طوعاً و کرہاً، محمدؐ کے نصب العین سے بلند نصب العین اپنے سامنے کبھی نہیں رکھا۔ یہ نصب العین عام انسانی سطح سے بہت بلند تھا۔ مافوق البشر نصب العین۔ یہ نصب العین کیا تھا؟ خدا اور بندے کے درمیان جو توہمات کے پردے حائل ہو چکے تھے انہیں ایک ایک کر کے اُٹھا دینا، اور اس طرح خدا کو انسان کے سینے میں سمو دینا اور انسان کو خدائی صفات کے رنگ میں رنگ دینا، اور باطل خداؤں کے ہجوم میں ایک منزہ خدا کا مقدس اور معقول تصور پیش کرنا۔ آج تک کبھی کسی انسان نے اس کی ہمت نہیں کی کہ اس قسم کے عظیم الشان کام کا بیڑہ اٹھائے جو انسانی مقدرت سے باہر ہو اور اس کے ذرائع اس قدر مسدود ہوں۔ اس لئے کہ نہ اُس وقت جب اُس نے اس اہم فریضہ کا تصور کیا تھا اور نہ اُس وقت جب اس کی عملی تشکیل کے لئے قدم اٹھایا تھا۔ اُس کے پاس اپنی ذات یا صحرا کے ایک گوشے میں بسنے والے مٹھی بھر انسانوں سے زیادہ کوئی ساز و سامان اور ذریعہ اور وسیلہ تھا ــــ اس فقدانِ ذرائع کے ساتھ آج تک کبھی کسی انسان نے دنیا میں اس قسم کا عظیم اور مستقل انقلاب پیدا نہیں کیا۔ وہ انقلاب جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو سو سال کے اندر اندر اسلام عملاً اور امتداداً تمام عرب پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس نے خدا کے نام پر، ایران، خراسان، مغربی ہندوستان، شام، مصر، حبش، شمالی افریقہ کا تمام وہ علاقہ جو اس وقت دریافت ہو سکا تھا، اور بحیرہ روم کے متعدد جزائر اور ہسپانیہ تک کو فتح کر لیا تھا۔

اگر نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور نتائج کی درخشندگی، انسانی بنوغ (HUMAN - GENIUS) کا معیار ہیں تو وہ کون ہے جو اس باب میں محمدؐ کے مقابلہ میں کسی اور انسان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکے۔ دنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون یا سلطنتیں پیدا کیں، وہ زیادہ سے زیادہ مادی قوتوں کی تخلیق کر سکے جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔

لیکن اس انسان نے صرف ہوش وعساکر، مجالس قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں کو ہی حرکت نہیں دی بلکہ ان کروڑوں انسانوں کے قلوب کو بھی جو اس زمانہ کی آباد دنیا کے ایک تہائی حصہ میں بستے تھے اور ان سے بھی کہیں زیادہ۔ اس شخصیت نے قربانگاہوں، دیوتاؤں، مذاہب ومناسک تصورات ومعتقدات بلکہ روحوں تک کو ہلا دیا۔ اس نے ایک ایسی کتاب کی اساس پر جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ایک ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک اُمّتِ واحدہ پیدا کردی، یہ لافانی امت اور باطل کے خداؤں سے سرکشی وتنفر، اور ایک خدائے واحد کے لئے والہانہ جذب وعشق، یہ ہیں دنیا میں اس عظیم ہستی کی یادگاریں، افسانوی خداؤں کے ہجوم میں، ایک خدا کے تصور کا اعلان، بجائے خویش ایک ایسا معجزہ تھا کہ جونہی یہ الفاظ اس منادی کی زبان سے نکلے، اس نے تمام باطل خداؤں کی عبادت گاہوں کو تباہ کردیا اور ایک تہائی دنیا میں آگ لگادی۔ اُس کی زندگی، اس کے مراقبات، توہم پرستی کے خلاف اس کی مجاہدانہ سعی وکاوش اور باطل خداؤں کے غیظ وغضب کو استحقار کی ہنسی سے ٹھکرا دینے کی عظیم جرأت، مکی زندگی میں متواتر تیرہ برس تک "تمام مصائب ونوائب کے مقابلہ میں، استقامت واستقلال، مخالفین کی تضحیک وتکذیب کا خندہ پیشانی سے استقبال — یہ تمام مشکلات اور پھر ان کے بعد اس کی ہجرت، اُس کی مسلسل دعوت وتبلیغ، اس کا غیر منقطع جہاد، اپنے مقصد کی کامیابی پر یقین محکم اور نامساعدتِ حالات میں اس کی مافوق البشر جمعیتِ خاطر، فتح وکامرانی میں تحمل وعفو، سلطنت سازی کی خاطر نہیں بلکہ اپنے الوہیاتی مقصد کی کامیابی کے لئے اُس کی اُمنگیں، اور آرزوئیں۔ وجد وکیف کی دنیا میں اُس کی متواتر نمازیں اور دعائیں، اپنے اللہ سے راز ونیاز کی باتیں، اُس کی حیات، اُس کی ممات، اور بعد از موت اس کی مقبولیت، یہ تمام حقائق کس قسم کی زندگی کی شہادت دیتے ہیں! کیا ایک کذب ومفتری کی زندگی کی یا ایسے انسان کی زندگی کی جسے اپنے دعوے کی حقانیت پر غیر متزلزل یقین ہو! اس کا یہی کوہ شکن ایمان تھا جس نے اس میں ایسی لرزہ انگیز اور بے پناہ قوت پیدا کردی تھی، اُس نے اپنے عقیدہ کو زندہ اور پائندہ بنا کر دکھا دیا۔ یہ عقیدہ کیا تھا؟ خدا کی توحید اور تنزیہہ — اول الذکر یہ بتلانے کے لئے کہ خدا کیا ہے اور ثانی الذکر اس کی وضاحت کے لئے کہ خدا کیا نہیں — وہ اِلَّا اور یہ لَا — ایک حصہ دنیا سے باطل خداؤں کو مٹانے کے لئے (خواہ اس میں تلوار کی بھی ضرورت کیوں نہ پڑے) اور دوسرا حصہ خدائے حقیقی کی مسندِ اجلال بچھانے کے لئے۔

بہت بڑا مفکر، بلند پایہ خطیب، پیغامبر، مقنن، سپہ سالار، تصورات ومعتقدات کا فاتح، صحیح نظریہ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قائم کرنیکا ذمہ دار، اس نظام کا بانی جس میں باطل خداؤں تک کی دنیا میں

دخل نہ پاسکیں جیسی دنیاوی سلطنتوں اور ان کے اوپر ایک آسمانی بادشاہت کا بانی ـــ یہ ہے محمد۔

ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ماپا اور پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد اس سوال کا جواب دو کہ

"کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی ہوا ہے ؟"

آپ نے غور فرمایا برادران! کہ ایک حقیقت شناس "غیر مسلم" کی نگاہیں کہاں تک پہنچی ہیں اور اس نے اس 'رحمۃ للعالمین' کی جھلک کہاں کہاں اور کس کس انداز سے دیکھی ہے ؟

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس 'رحمۃ للعالمین' کے ظہور کے بعد، مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہے جس میں ان کی ساری صلاحیتیں مفلوج و مصلوب ہو چکی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ اس کی وجہ خود قرآن نے بیان کر دی ہے، جہاں کہا ہے کہ حضورؐ رحمت تو ضرور ہیں لیکن صرف ان کے لئے جو ایمان لائیں ـــ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ۔ (۹/۶۱) آپ کہیں گے کہ مسلمان، قرآن اور صاحبِ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دعوٰے ذرا غور طلب ہے۔ مسلمان قرآن اور نبی اکرمؐ کے اسمِ گرامی کے ساتھ اپنی نسبت ضرور رکھتے ہیں لیکن نسبت رکھنے اور ایمان رکھنے میں بڑا فرق ہے۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے اصولوں کو زندگی کا نصب العین بنا لیا جائے اور اس ضابطۂ حیات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ اس کی وضاحت قرآن نے اس مقام پر کر دی ہے جہاں حضورؐ کو رحمت للعالمین کہا ہے فرمایا۔ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (۲۱/۱۰۸) ان سے کہہ دو کہ میری طرف یہ وحی ہوتی ہے کہ تمہارا الٰہ، جس کے قوانین کی اطاعت اختیار کرنی چاہیئے، صرف ایک (خدائے واحد) ہے۔ اب بتاؤ کہ کیا تم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو ؟ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا سر قرآن کے سامنے خم ہے یا اس سے سرکشی برتتے ہوئے اپنے خود ساختہ قوانین و ضوابط کے سامنے ؟ غیر مسلم تو قرآن کے متعلق یہ کہتے ہیں۔ کہ

اس کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے تمدن کے باوجود اس کی حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

(گوئٹے کا خط، ایکرمن کے نام)

لیکن ہم نے اس قرآن کو غلافوں میں لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے اور اپنی راہ نمائی کے لئے دوسرے دروازوں پر جبہ سائی کرتے ہیں۔ کیا ایمان اسی کو کہتے ہیں ؟ لہٰذا، اگر ہماری صلاحیتیں نشو و نما نہیں پاتیں تو اس میں قصور کس کا ہے۔ سورج اسی

ایک ہی راہ

کو روشنی دے سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول رکھے۔ بارش اسی زمین کے لئے نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے جو اس کے قطروں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے اپنی آغوش وا کر دے۔ ہم نے اس سحابِ کرم کی طرف سے اپنے لب بند کر کے، دنیا کے ہر چشمہ تہذیب و تمدن کو آزما کر دیکھ لیا۔ کیا کہیں سے آبِ حیات کی ایک

بوند بھی ہمارے لئے وجہ سیرابی ہوئی؟ کیا اس کے بعد بھی وقت نہیں آیا کہ ہم پھر اسی ابرِ نیساں کی طرف رجوع کریں جس کی گہر افشانیوں نے ایک بار ہماری زمینِ مردہ کو اس طرح زندگی اور شادابی عطا کی تھی کہ اس سے ساری دنیا پر بہار آگئی تھی۔ یاد رکھیے!۔

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ مکمل شکل میں دیدیئے گئے۔ اب اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

(معراجِ انسانیت)

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قرآنی نظام کے علاوہ جسے حضورؐ رحمۃ للعالمین نے ساری دنیا کے لئے وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ بنایا تھا۔ انسان کے لئے نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں۔ اس نظام کی کسی ایک شق کو اپنانے سے بے شک کسی حد تک اس کے فوائد حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن دنیا اسی صورت میں موجودہ جہنم سے نکل سکے گی جب وہ اس نظام کو بہ حیثیت کلی اختیار کرلے گی۔ اسی سے وہ مساعد فضا پیدا ہوتی ہے جس میں ہر تخمِ صالح بڑھتا، پھولتا اور پھلتا ہے — كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ اگر صحنِ عالم اس کی نسیمِ سحری سے محروم ہو جائے تو اس کی تمام سرسبزیاں اور شادابیاں جھلس کر رہ جائیں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمۂ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

مسلسل

دین کی باتیں

(پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کے اہم نکات ——— مرتبہ محترمہ ثریا عندلیب)

(۱) انسانی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لئے دیں ۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ہیئت پر پیدا کیا ۔ لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو پست ترین سطح پر لے جاتا ہے ۔ ایسی پست سطح تک کہ یہ حیوانات سے بھی نیچے گر جاتا ہے ۔ اور یوں بدترین مخلوق بن جاتا ہے ۔

(۳) خدا کی رزق پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر عاید ہوتی ہے ۔ اور جو معاشرہ اس فریضہ کو سرانجام نہیں دیتا وہ خدا کی حفاظت میں نہیں رہتا ۔

(۴) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ دوسروں کی ضروریات کے لئے کس قدر دے دیا جائے ۔ ان سے کہہ دو کہ جسقدر تمہاری ضروریات سے زاید ہے سب !

(۵) جو کام کسی سے مجبوراً کرایا جائے اس میں نیکی اور بدی یا ثواب اور عذاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

(۶) قرآن اخلاقی اقدار پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس نظام زندگی کی اقامت کی تاکید کرتا ہے جس میں اخلاقی اقدار معاشرہ میں از خود رواں دواں رہتی ہیں ۔

(۷) جب ہم قرآن کریم پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں تو خدا سے ہمارا تعلق قائم ہو جاتا ہے ۔ جب ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں تو خدا سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے ۔

(۸) سمندر میں ایک تنکے کی طرح زندگی بسر کرنا کہ ہر موج اسے اپنے ساتھ بہا کر لے جائے قابل فخر زندگی نہیں ۔ انسان کو ضبط خویش سے پہاڑ کی طرح محکم ہونا چاہیئے کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی اسے اپنے مقام سے نہ ہلا سکے ۔

(۹) مرد مومن دنیا کی زیبائش و آرائش سے نفرت نہیں کرتا ۔ وہ ان سب سے لذت یاب ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز اس کے راستے میں حائل ہو کر اس کے لئے زنجیر پا نہیں بن سکتی ۔

(۱۰) فرقہ بندی اسلام کے خلاف اور قرآن کی رو سے شرک ہے ۔

(۱۱) اختلاف عمل اور وحدت امت دو متضاد چیزیں ہیں ۔

نقد و نظر

عزیز بھٹی شہید ——— زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!

فرہادی محنت سے مرتب کردہ، محبت کے آنسوؤں سے تحریر نمودہ اور حسنِ ذوق کی پاکیزگی کے ساتھ پیش کردہ اصغر علی گھرال (ایڈووکیٹ گجرات) کی یہ 'تالیف' درحقیقت اس قرضہ کو چکانے کی مبارک کوشش ہے جو شہدائے پاکستان کے مقدس لہو کی صورت میں قوم کے سر پہ ہے۔ ان مایہ ناز فرزندانِ اسلام کی یاد تازہ رکھنے کیلئے مختلف شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک ان میں سب سے زیادہ مؤثر اور پائیدار صورت یہی ہے کہ ان کے سوانح حیات، محفوظ کر دیئے جائیں۔ محترم مؤلف نے اس (قریب پونے چھ سو صفحات کی درخشندہ) کتاب میں شہید عزیز کی پوری زندگی کے متعلق جس قدر معلومات فراہم و یکجا کر دی ہیں، ہم نہیں سمجھتے کہ ان میں کچھ بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور انہیں تلاش کرنے میں انہیں جس قدر کوشش کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ کتاب دیکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص برکی کے محاذ (یعنی شہید کی زندگی کے آخری سات دنوں) کے جزئیاتی واقعات کے متعلق تو ذہن میں نہیں آتا کہ انہوں نے کہاں سے اور کس طرح حاصل کی ہیں۔ پھر انہیں پیش کرنے کا انداز اس قدر دلکش اور جاذب ہے کہ قاری اپنے آپ کو شہید عزیز کے ہمرکاب چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ ہم محترم اصغر علی صاحب کو ان کی اس جگر تابانہ سعی مشکور پر مستحق صد مبارک باد سمجھتے ہیں۔

ان سوانح حیات سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ شہید عزیز نے جس والہانہ شیفتگی سے اپنے آپ کو ملت پر نثار کیا ہے، یہ کسی ہنگامی جذبہ کی تخلیق نہیں تھی۔ اس کی ساری زندگی حسنِ سیرت اور رعنائی کردار کی آئینہ دار تھی۔ اور اس کی یہ قربانی اس کا فطری نتیجہ تھی۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے قوم کا یہ بطلِ جلیل ساری عمر اپنے آپ کو اسی حسین انجام کے لئے تیار کرتا رہا تھا۔ اقبال نے کہا تھا۔ کہ ؎

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

— شہید عزیز ——— اقبال کے اسی تصور کا حسین پیکر نظر آتا ہے۔ طوبیٰ لہ وحسن مآب

عشق و خرد کا یہ دلکش مرقع، پندرہ روپے کی حقیر سی قیمت میں 'مکتبۃ الوکیل گجرات' سے مل سکتا ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے اربابِ حل و عقد کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ اس قسم کی سیرت ساز کتابیں ہمارے نصابِ تعلیم میں ہونی چاہئیں

سادگی و پرکاری

نقاب پوش جماعتیں پراپیگنڈے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرتی ہیں، جب حقیقت دراپے پردہ ہو کر سامنے آتی ہے تو انسان محو حیرت رہ جاتا ہے کہ اس دور میں الہٰی سیاست کس کس قسم کے کھیل کھیلنا سکھاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ عرصہ سے جماعت اسلامی کے اخبارات و رسائل میں ایک کتاب کا اسقدر ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کتاب کا نام ہے۔

JEWISH CONSPIRACY

THE PROTOCOLS OF THE LEARNED

ELDERS OF ZION.

اخبارات و مجلات میں اس کتاب کے تعارف کے سلسلہ میں کہا گیا کہ یہودی لیڈروں کی کچھ ایسی دستاویزات ہاتھ لگی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اس قوم کے عزائم کیا ہیں۔ یہودیوں کے خلاف شروع ہی سے بالعموم، اور اسرائیلی مملکت کے وجود میں آنے کے بعد سے بالخصوص، مسلمانوں کے دل میں نفرت و عداوت کے جو جذبات موجزن ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ اس قوم کی ساری تاریخ اسلام کے خلاف سازشوں کی بھیانک داستان ہے۔ اس لئے جب یہ کہا جائے، کہ اس قوم کے زعماء کی کچھ ایسی دستاویزات ہاتھ آئی ہیں جن سے ان کے پوشیدہ مذموم ارادے بے نقاب ہو کر سامنے آگئے ہیں، تو کونسا حساس مسلمان ہوگا جس کے دل میں اس کتاب کو دیکھنے کی تڑپ پیدا نہ ہوگی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس کتاب نے ملک میں بڑی شہرت حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی سے غیر متعلق حلقوں میں بھی اس کا کافی چرچا ہو گیا۔ لیکن جب یہ کتاب ہمارے سامنے آئی تو ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کہ یہ جماعت اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرتی ہے۔

کتاب کے نصف آخر میں یہودیوں کے (PROTOCOLS) دیئے گئے ہیں۔ ان کے تمہیدی تعارف میں بتایا گیا ہے کہ روس میں ایک عیسائی پادری تھا ـــــ NILUS نامی ـــ اس نے ۱۹۰۵ء میں ان دستاویزات کا روسی ترجمہ شائع کیا تھا۔ اور تعارف میں بتایا تھا کہ وہ ترجمہ (جس کی اصل عبرانی میں تھی) ایک عورت نے فری میسنوں (FREE - MASONS) کے ایک اجلاس سے چرا کر، نائیلس کے ایک دوست کو دیا تھا، اور اس نے اسے نائیلس تک پہنچا دیا۔ پھر ۱۹۲۰ء میں اس کا انگریزی ترجمہ انگلستان میں شائع ہوا جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں ہے۔ اس نسخہ کے مطابق زیر نظر کتاب شائع کی گئی ہے۔ اس کے شائع کرنے والے ہیں مصباح الاسلام فاروقی صاحب، جو جماعت اسلامی کی تازہ تخلیق، ادارہ معارف اسلامی کراچی، سے متعلق ہیں۔

کتاب کے اس چیستانی تعارف سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لوگوں کے دل میں اس سے کس قدر دلچسپی پیدا ہو گئی ہو گی۔ لیکن یہ دلچسپی پیدا کس لئے کی گئی، اس کا اندازہ آپ کتاب دیکھے بغیر نہیں کر سکتے۔ اسے ذرا غور سے سنئیے۔

جب سے صدر ناصر نے اخوان المسلمین کے خلاف چارہ جوئی کی ہے، جماعت اسلامی اس کی بدترین دشمن ہو گئی ہے اور اسے بدنام کرنے کی مہم میں مصروف ہے۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب یہ جماعت کسی کو بدنام کرنے کے "جہاد" میں مصروف ہو جائے تو پھر اس کے خلاف کیا کیا کچھ نہیں کہا، اور کیا کرتی ـــ زیر نظر کتاب کی اشاعت بھی درحقیقت اسی مقصد کے حصول کی ایک کڑی ہے۔ "یہودی دستاویزات" وہ شکنجہ ہے جس میں لپیٹ کر یہ گویا قوم کے حلق سے اتاری جا رہی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں ـــ "یہودی سازش" کے عنوان سے، مولانا ظفر احمد انصاری کا ایک مبسوط مقالہ دیا گیا ہے۔ اور اسی مقالہ کی اشاعت اس کا اصلی مقصود ہے۔ ہم، صاحب مقالہ، انصاری صاحب کی سابقہ زندگی کے ریکارڈ کی طرف نہیں جانا چاہتے، جاننے والے انہیں خوب جانتے ہیں ـــ اس وقت، وہ ایک طرف، جینوا میں اس اسلامک سنٹر سے وابستہ ہیں جو تحریک اخوان المسلمین کا مرکز ہے۔ اور شہور اخوانی لیڈر رمضان سعید جس کے سربراہ ہیں۔ دوسری طرف، انصاری صاحب اس ادارہ معارف اسلامی (کراچی) کے رکن ہیں جس کے صدر مودودی صاحب ہیں۔ اس کتاب میں، انصاری صاحب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

> انصاری صاحب برصغیر کی تحریک آزادی کے ایک عظیم مجاہد ہیں۔ بلند حوصلہ۔ کسی سے نہ دبنے والے اور عملی سیاسیات کے بڑے دیدہ ور۔　　(ص۹)

ہمیں اس وقت انصاری صاحب سے کچھ دلچسپی نہیں، دلچسپی ان کے اس مقالہ سے ہے۔

اس میں پہلے تو یہ کہا گیا ہے کہ روس کا بالشویکی انقلاب درحقیقت یہودیوں کا پیدا کردہ تھا۔ اور اب بھی وہاں کی زمامِ اقتدار یہودیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ (ہمیں مقالہ کے اس حصہ سے بھی سردست دلچسپی نہیں) اس کے بعد اس میں یہ کہا گیا ہے کہ:-

(۱) اسرائیلی مملکت کے قیام میں، امریکہ۔ برطانیہ کے علاوہ روس کا بھی ہاتھ تھا۔

(۲) اس مملکت کے قیام کی سب سے زیادہ مخالفت اخوان المسلمین کی طرف سے ہوئی۔ علاوہ بریں شاہ فاروق بھی، عربوں کے اتحاد سے، اس مملکت کو ختم کر دینے کے درپے تھا۔

(۳) سامراجی طاقتوں کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو شاہ فاروق اور اخوان المسلمین دونوں کو ختم کر کے اسرائیلی اقتدار کے لئے راستہ ہموار کر دے۔

(۴) ان طاقتوں کو یہ شخص کرنل ناصر کے پیکر میں مل گیا۔ چنانچہ اس نے شاہ فاروق کو معزول اور اخوان المسلمین کو مغلوب کر کے اسرائیلی اقتدار کو مستحکم کر دیا۔ اور اب اسرائیلی مملکت کا سب سے بڑا حامی صدر ناصر ہی ہے۔ اس میں یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ صدر ناصر نے نہرِ سویز کے سلسلہ میں جو آویزش کی تھی تو اس سے بھی درحقیقت اسرائیلی مملکت کے لئے توسیع کے مواقع بہم پہنچانا تھا۔[1]

غرضیکہ — اس سارے مقالہ میں، صدر ناصر کے خلاف اس قدر زہر اگلا گیا ہے کہ کتاب ختم کرنے کے بعد قاری اپنے دل میں، یہودیوں کے خلاف کم لیکن صدر ناصر کے خلاف کہیں زیادہ جذباتِ نفرت وعناد مشتعل پاتا ہے۔ اور یہی مقصد اس کتاب کی اشاعت سے ہے۔ اس کی عام اشاعت کے لئے، کتاب کے شروع میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس کے حقوق محفوظ نہیں۔ جس کا جی چاہے، اسے شائع کر سکتا ہے۔

دیکھا آپ نے پراپیگنڈے کا طریقہ!

اس پراپیگنڈے کے ڈانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں، اسے بھی ایک نظر دیکھتے جائیے۔ اخوان المسلمین کے خلاف جو کچھ مصر میں ہوا تھا، جماعتِ اسلامی نے اس کا بھی بڑے شد و مد سے پراپیگنڈا کیا تھا۔ اس سلسلہ میں جو خبریں ان کی طرف سے شائع ہوتی تھیں وہ بیشتر سوئٹزرلینڈ ایجنسی انٹرنیشنل

---

[1] یہ سطور اس وقت لکھی جا رہی ہیں جب عرب۔ اسرائیل کی حالیہ جنگ کو چھڑے دو چار روز ہی ہوتے ہیں۔ اس جنگ کے بعد شاید یہ بھی کہا جائے کہ اس سے بھی صدر ناصر کا مقصد اسرائیلی مملکت کو تقویت پہنچانا تھا۔

(AMNESTY INTERNATIONAL) کی رپورٹوں پر مبنی تھیں۔ اس انٹرنیشنل کا تعارف مودودی صاحب نے ان الفاظ میں کرایا تھا۔

اخوان المسلمون کے سلسلے میں رسائل واخبارات میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں، ان میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کا ذکر کئی بار ہوا ہے۔ ایک رفیق نے مولانا سے اس کے بارے میں پوچھا تو مولانا نے فرمایا۔

"یہ عالمی سطح پر قائم شدہ ایک ادارہ ہے جو دنیا کے مختلف ملکوں کے وکلاء، صحافی اور آزادی ومساوات اور انصاف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی سے ناانصافی ہو، اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ادارہ جس کیس کو ہاتھ میں لے لیتا ہے اس پر اپنی پوری کوشش صرف کر دیتا ہے۔ خان عبدالغفار خان ایک مرتبہ اسی ادارے کی کوششوں سے رہا کئے گئے تھے۔ اسی طرح شیخ عبداللہ کے کیس کو بھی انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لعہ پہلی بار شیخ عبداللہ اسی کی کوششوں سے رہا ہوئے —— یہ ادارہ ناانصافی کو ختم کرنے اور انصاف کو روبعمل لانے کے لئے متعلقہ حکومتوں پر مختلف ذرائع سے اخلاقی دباؤ ڈالتا ہے"

ایک صاحب نے پوچھا کیا اخوان کے کیس کو اس ادارے نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟

مولانا نے جواب دیا:

"ابھی تک تو نہیں لے سکا، لیکن وہ اس معاملے پر پوری پوری توجہ ضرور دے رہا ہے حال ہی میں اس ادارے نے اخوان کے مقدموں کے بارے میں ایک رپورٹ بھی شائع کی ہے"

(ہفتہ وار آئینہ ۔ لاہور ۔ مورخہ ۱۲ جون)

یعنی انہوں نے بتایا کہ یہ ادارہ خالصتہً انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور گروہی سیاسیات سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس ادارہ کے بانی مسٹر بینن سن (BENANSON) نے گزشتہ مارچ میں اس ادارے سے یہ کہہ کر استعفےٰ دے دیا تھا کہ اس کی ایگزیکٹو کمیٹی کے چیئرمین کو سی۔ آئی۔ اے (C.I.A) کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے۔ اس لئے اس کا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس ادارہ کے ساتھ وابستہ رہے۔ یہ ہے اس ادارہ کی حقیقت جو اخوان المسلمین کے مسئلہ کو اس قدر اچھال رہا تھا۔ اور

جیسے مودودی صاحب، عدل و انصاف کا علمبردار بنا رہے تھے۔

بہرحال، یہ تھا مقصد زیرِ نظر کتاب کی اشاعت سے ــــ لیکن فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ابھی اس کتاب کا ڈسٹ کور بھی میلا نہیں ہونے پایا تھا کہ اسرائیل نے مصر کے خلاف یورش کر دی اور اس کے جواب میں صدر ناصر نے، متحدہ عرب محاذ قائم کر کے، اسرائیل کے خلاف بھرپور جنگ شروع کر دی ــــ اس اسرائیل کے خلاف جس کے متعلق اس کتاب میں کہا گیا ہے کہ اس کا وجود ہی صدر ناصر کی سازش کا رہینِ منت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے جماعتِ اسلامی عجیب مخمصہ میں پھنس گئی کہ اب دنیا کو کیا منہ دکھایا جائے گا۔ لیکن اس قسم کے گردابوں سے صاف نکل جانا تو اس جماعت کا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ چنانچہ عرب، اسرائیلی جنگ کے اعلان کے دوسرے ہی دن، امیر جماعت، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی طرف سے حسبِ ذیل بیان اخبارات میں شائع ہو گیا۔

> امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مشرقِ وسطیٰ کی جنگ کو جہاد قرار دیتے ہوئے عرب ملکوں سے اپیل کی ہے کہ ناجائز یہودی مملکت، اسرائیل کے خاتمے تک یہ مقدس لڑائی جاری رکھی جائے۔ مولانا مودودی نے آج متحدہ عرب جمہوریہ، شام، عراق، اردن، کویت، سعودی عرب، سوڈان، مراکش، تونس اور الجزائر کے سربراہوں کے نام بحری تار ارسال کئے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ پاکستانی مسلمان اسرائیل کی جارحیت اور اس کے برطانوی اور امریکی حواریوں کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ آزمائش کی اس گھڑی میں ہم دل و جان سے اپنے عرب بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ اور آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ جب تک اسرائیل کی عیار مملکت کا ناپاک وجود صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں جاتا آپ اللہ اور اسلام کے نام پر متحدہ طریقے سے یہ مقدس جہاد جاری رکھیں۔
>
> (امروز۔ مورخہ ۶/۶/۶۷ء)

لیجئے! وہی ناصر جو اسرائیلی مملکت کے وجود پذیر ہونے میں سامراجی قوتوں کا آلۂ کار، اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن، قرار دیا جا رہا تھا۔ اب اسلام کا سب سے بڑا مجاہد اور اللہ کے نام پر مقدس جنگ کا قائد قرار پا گیا۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس جماعت کے نزدیک صدر ناصر کی یہ پوزیشن کب تک قائم رہتی ہے۔

پس تحریر ۔ حال ہی میں مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں اس کتاب کا ذکر آیا ہے اور حکومت کی طرف سے کہا گیا ہے کہ اس کے خلاف باضابطہ کارروائی کی جائے گی۔ (حرمہ ۱۴ جون ۱۹۶۷ء)

مسلمانوں کی فتوحات

[کچھ عرصہ ہوا پرویز صاحب کی چند ایک تقاریر (جمہوری آواز) کے سلسلہ میں، ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی تھیں۔ یہ تقاریر اردو میں لکھی گئی تھیں اور ریڈیو نے انہیں پنجابی زبان میں نشر کیا تھا۔ ان تقاریر کے سلسلہ کی پہلی کڑی ـــ اسلامی نظام کے عنوان سے ـــ اگست ۱۹۶۵ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس کی دوسری کڑی پیش خدمت ہے۔ (طلوع اسلام)]

اسلام کے معنی ہیں خدا کے احکام اور قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے جس میں وہ ان قوانین کو عملاً رائج کر سکیں۔ نبی اکرم نے صحابہؓ کی جماعت کے ساتھ اسی قسم کی مملکت مدینہ منورہ میں قائم فرمائی۔ یہ مملکت ایسا نظام قائم کرنا چاہتی تھی جس میں کوئی ظالم کسی کمزور و ناتواں پر کسی قسم کی زیادتی نہ کرنے پائے۔ کوئی طاقت ور کسی دوسرے کی محنت کو غصب نہ کر سکے۔ ایسا نظام مکہ کے قریش، عرب کے دیگر قبائل اور سود خوار یہودیوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ کیونکہ اس سے ان کی مفاد پرستیاں ختم ہو جاتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس مملکت کے قیام کی بھی سخت مخالفت کی۔ اور اس کے قائم ہو جانے کے بعد، اسے ختم کر دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ ان کے مقابلہ کے لئے، حضور نبی اکرمؐ کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اور چونکہ آپ حق و صداقت کا علم بلند کرنے اور دنیا میں میزانِ عدل و انصاف کھڑی کرنے کے لئے مصروف جہاد تھے۔ اس لئے ہر لڑائی میں اسلامی لشکر کو کامیابی ہوتی اور دشمنوں کو شکست پر شکست اٹھانی پڑی۔ شکست کے بعد، وہ اپنی خوشی سے اسلام قبول کر لیتے تھے، اور ان کا علاقہ از خود اسلامی مملکت کا حصہ بن جاتا تھا۔ اسطرح اس مملکت کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ جب حضورؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو تمام عرب، جنوبی فلسطین اور عراق کے کچھ حصے اسلامی مملکت میں شامل ہو چکے تھے۔ اور اسکا مجموعی رقبہ قریب دس لاکھ مربع میل پر مشتمل تھا۔ اسے اگر دس سال کی مدت پر پھیلا دیا جائے تو قریب پونے تین سو مربع میل فی دن کے حساب سے

فتوحات حاصل ہوئیں۔ لیکن اتنی بڑی عظیم مملکت کے واحد حکمران، یعنے نبی اکرمؐ کی یہ کیفیت تھی کہ آپ کا صرف ایک جوڑہ کپڑا ہوتا تھا۔ گھر میں کوئی ساز و سامان نہیں تھا۔ وفات کے وقت حضورؐ کے ہاں سات دینار تھے، جنہیں آپ نے بیت المال میں داخل کر دیا، تاکہ غریبوں اور محتاجوں کے کام آسکیں۔ اور اس طرح یہ شاہنشاہ بوریہ نشین علیہ الصلوٰۃ والسلام اتنی وسیع مملکت قائم کر کے دنیا سے تشریف لے گئے۔

حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں ایران اور روم کی سلطنتیں دنیا کی عظیم ترین مملکتیں تھیں اور صدیوں سے بہت بڑی تہذیب کی وارث چلی آ رہی تھیں۔ لیکن ان میں مظلوم کاشتکاروں اور غریب کسانوں پر بڑے مظالم ہوتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے ایران کے شاہنشاہ کسریٰ اور روم کے بادشاہ قیصر کو لکھا تھا کہ جو جور و ستم ان مظلوموں پر روا رکھا جاتا ہے، اُسے ختم نہ کیا گیا تو اُس کی ذمہ داری اُن کے سر پر عاید ہوگی۔ انہوں نے اس تنبیہ کا کوئی اثر نہ لیا اور وہاں کے غریب باشندے بدستور ظلم و استبداد کا نشانہ بنائے جاتے رہے۔ ان مظلوموں کی دادرسی کے لئے مسلمانوں کو ان علاقوں کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ ایک طرف عراق کی طرف لشکر کشی کی گئی اور دوسری طرف شام کی طرف۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا ہی تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہو گیا۔ اور حضرت عمرؓ ان کے جانشین منتخب ہوئے۔ آپ کا دور اسلامی فتوحات کا شاندار زمانہ ہے۔ اس عہد میں شام، ایران، مصر، ایشیائے کوچک کے بعض علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت یہ مملکت قریب ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی، اور صرف ایک علاقہ عراق کی مال گزاری ساڑھے گیارہ کروڑ درہم سالانہ تھی، مصر کا خراج ایک کروڑ بائیس لاکھ دینار تھا۔ لیکن اتنی وسیع اور دولتمند مملکت کے سربراہ کے تہ بند پر دس دس پیوند لگے ہوتے تھے۔

تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں فتوحات کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ایک طرف اسکندریہ، آرمینیا، افطاکیہ، قبرص، روڈس، طرابلس، مراکش کے علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہو گئے۔ دوسری طرف طبرستان اور جرجان بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ اسطرح اسلامی مملکت کا رقبہ بڑا وسیع ہو گیا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد بنی امیہ کے زمانے میں مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ اور بھی وسیع ہوتا چلا گیا۔ شمالی افریقہ کے دور افتادہ مقامات، صحرائے اعظم، ایشیائے کوچک، دوسری طرف، روسی ترکستان اور اس کے اردگرد کے علاقے، تاتار کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ سترہ سالہ نوجوان محمدؐ بن قاسم نے سندھ اور ملتان فتح کئے۔ یہ آج سے بارہ سو سال پہلے کی بات ہے۔ اُدھر اسلام کے قابلِ فخر مجاہد، طارق نے اسپین پرتگال اور جنوبی فرانس میں اسلام کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ وہ تو یوں کہئے کہ خلیفہ نے کسی غلط مصلحت کے تحت

اسلامی فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ورنہ جنوبی یورپ اسی زمانے میں مسلمانوں کے زیر نگین آگیا ہوتا۔

دوسری صدی ہجری کے شروع میں، فرغانہ اور خوقند کے علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ نیز کاکیشیا (کوہ قاف) اور صقلیہ (سسلی) پر بھی اسلامی پرچم لہرانے لگا۔

عباسیوں کے دورِ حکومت میں مسلمانوں نے مشرقی اور جنوبی افریقہ کے کئی علاقے فتح کر لئے تیسری صدی ہجری میں افغانستان اور روسی ترکستان میں اسلام کا نور پھیلا اور یہ علاقے مسلمانوں کی مملکت میں شامل ہو گئے۔

ساتویں صدی ہجری میں، جبکہ روما کی سلطنت بڑے عروج پر تھی، ترکوں نے اس طرف قدم بڑھائے اور ایڈیانوپل پر قبضہ کر کے، ایک مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے قریب ایک سو سال بعد، سلطان محمد خان ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا اور اس طرح عثمانی سلطنت کا شمار یورپ ہی نہیں، بلکہ دنیا کی عظیم ترین مملکتوں میں ہونے لگا۔ ترکوں کی یہ مملکت اُس وقت سے آج تک قائم ہے۔ اِدھر ہندوستان میں، چوتھی صدی ہجری میں راجہ جے پال نے غزنی پر حملہ کر کے اسے تباہ کرنا چاہا، تو سلطان سبکتگین نے اُسے شکست فاش دی اور اس طرح ہندوستان کے کچھ علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ راجہ جے پال نے، سبکتگین کے بیٹے، محمود غزنوی کے زمانے میں پھر غزنی پر حملہ کیا۔ اور اس مرتبہ ایسی فاش شکست کھائی کہ جہلم تک کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ یہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی نے تھانیسر کو فتح کیا اور جنوبی ہند میں سومنات تک بڑھتا چلا گیا، ۴۰۹ھ میں کشمیر پر حملہ ہوا۔ اور وہاں کے راجہ کو مطیع کر لیا۔ چھٹی صدی میں سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی اور اجمیر فتح کیا اور اس کے ایک سال بعد، گوالیار، آگرہ، بنارس گجرات کے علاقے مسلمانوں کی مملکت میں شامل ہو گئے۔ ساتویں صدی میں سلطان علاؤالدین خلجی نے دکن فتح کیا۔ دسویں صدی میں شاہنشاہ بابر نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی جو تین سو سال تک قائم رہی۔ ۱۸۵۷ء عیسوی میں باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں پر زوال آ گیا۔ لیکن اسی زوال کے زمانے میں، ان میں سرسید، علامہ اقبال، اور قائداعظم جیسی عظیم شخصیتیں پیدا ہو گئیں۔ جن کی ان تھک کوششوں سے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی مبارک مملکت وجود میں آئی۔ خدا اس مملکت کو جسے اسلام کی گذشتہ عظمت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے حاصل کیا گیا ہے، ابدالآباد تک سلامت اور ترقی پذیر رکھے۔ دنیا میں اس وقت قریب چار کروڑ مربع میل رقبہ پر مسلمانوں کی سلطنتیں قائم ہیں۔

خورشید عالم

افریقہ ایشیا کا عالمی کردار[۲]

ایشیا میں یورپ نے جو کیا سو کیا — اس کا جائزہ اقساطِ ماقبل میں لیا جا چکا ہے — افریقہ میں یورپ نے کہیں زیادہ گھناؤنا کردار ادا کیا، اور کئے جا رہا ہے۔ اہل یورپ افریقہ پہنچنے سے بہت پہلے امریکہ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے امریکہ کو بدیں وجہ نئی دنیا کہا کہ اس کی دریافت سے پہلے وہ اس کے وجود سے بے خبر تھے۔ لیکن صحیح معنوں میں ان کے لئے نئی دنیا افریقہ تھا، امریکہ نہیں۔ اہل یورپ افریقہ کے سواحل سے اس حد تک واقف تھے کہ اس کا چکر کاٹ کر ہمارے برصغیر اور مشرق کے مالا مال جزائر تک پہنچا کرتے تھے۔ امریکہ کی دریافت کے بعد انہیں اس تاریک براعظم کے کناروں پر اتر کر اس کے اندر جھانکنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اندر جھانک کر دیکھنے سے افریقہ ایک نئی اور عجیب و غریب دنیا نظر آیا۔ انسان اور قدرت، دونوں نے افریقہ کو عجوبۂ روزگار خطہ بنا رکھا تھا۔ جادو کے دور کے افرنگی قبائل پر کسی اور کرّے کی مخلوق کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے جنگلات اپنی مثال آپ تھے۔ ان میں ایسے ایسے پودے اور درخت تھے جو کہیں اور نہیں ملتے تھے۔ جنگلات کے بیشتر مکین یعنے جانور بھی یکتائے روزگار تھے۔ یہ مناظر اور یہ مواقع اہلِ یورپ کے لئے غارت کی کھلی دعوت تھے۔ اپنی جس تہذیب پر شیخی بگھارتے یورپ تاریخ کا منہ چڑاتا چلا آ رہا تھا، اس کی روشنی میں اس نے افریقہ کے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے سیاہ فام افریقیوں میں امریکہ میں محنت کشی اور باربرداری کے لئے عمدہ جانور دکھائی دیئے۔ اپنے آپ کو اقدار و اخلاق کا علمبردار کہنے اور کہلوانے والا یورپ افریقہ میں آیا تو اس نے غلاموں کی تجارت کا بازار گرم کر دیا — انسان جانوروں کی طرح دھر لئے جاتے تھے۔ انہیں قساوتِ قلبی سے اغوا بھی کیا جاتا تھا اور بڑی دیدہ دلیری سے عام منڈیوں میں یوں مویشیوں کی طرح خریدا بھی جاتا تھا۔ ان انسانوں کو یورپ کا حیوانِ ناطق و مہذب چوپایوں کی طرح ہانک کر امریکہ لے جاتا تھا، اور وہاں یورپ ہی سے آئے ہوئے درندہ صفت آبادکاروں کے ہاتھ، اخلاق و اقدار کے تمام ملحوظات کو بالائے طاق رکھ کر، بیچ دیا کرتا تھا۔ افریقہ میں غلاموں کو حاصل کرنے، انہیں افریقہ

سے امریکہ تک پہنچانے اور امریکہ میں ٹھکانے لگانے کے تینوں مراحل تاریخِ انسانی کے شرمناک باب ہیں۔ اور تو اور خود بعض اہلِ یورپ اپنے کردار کے اس پہلو پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پیشانی پر اُبھر آنے والے عرقِ انفعال کے قطروں کو چھپائے چھپا نہیں سکتے۔ ضمیر کی یہ خلش اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ یورپ' امریکہ میں جو تلخ سرشت بیج بو کر بزعمِ خود تہذیب کے انگبین اور شہدِ ناب سے سینچتا رہا، اس کے میوۂ تلخ نے اس کے کام و دہن کو اس مشکل میں مبتلا کر دیا ہے کہ یورپ نہ اسے اُگل سکتا ہے، نہ نگل سکتا ہے۔ اب صدیوں پیچھے مڑ کے دیکھا جائے تو یورپ کے خللِ دماغ اور کاروبارِ غیر انسانی پر خندہ شیت صاف دکھائی دے گا۔ نوعِ انسان کے سفید فام شکاری کالے افریقیوں کو امریکہ کی تعمیر کے لئے ڈھور ڈنگر کی طرح لئے جا رہے تھے تو مشیت نے اس تعمیر میں "خرابی" کی ایسی صورت مضمر کر دی تھی جس کے نتائج بتدریج نمودار ہوئے۔ امریکہ کی کھیتی میں تخمِ یورپ بویا جانے لگا تو مشیت نے اس کھیتی میں حبشی غلاموں کا چھینٹا دے دیا۔ چنانچہ امریکہ میں یورپ کی فصل لہلہانے لگی تو اس کے خوشوں میں افریقی دانے نمایاں طور پر دکھائی دینے لگے۔ یہ دانے وہ سیہ فام ہیں جو آج امریکی سیلابِ نسل و رنگ کے سامنے بند باندھے کھڑے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں اور اخلاق و اقتدار کا پرچم بلند سے بلند تر کئے جا رہے ہیں۔ گویا جس افریقہ سے یورپ صدیوں غیر انسانی سلوک روا رکھتا چلا آیا، وہی افریقہ آج امریکہ میں یورپ کو انسانیت اور مساوات کا درس دے رہا ہے۔

غلاموں کی تلاش میں یورپ نے افریقہ کا چپہ چپہ چھان مارا تو یہ براعظم پورے کا پورا یورپ کے تصرف میں آ گیا۔ یورپ نے اپنی فطرت کے عین مطابق' افریقہ میں سنگدلانہ اور جبر گیر استعمال کا مظاہرہ کیا۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی استحصال اس کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ اور اس کا اس نے بھرپور مظاہرہ کیا۔ افریقہ کی بے پایاں دولت کو اس نے خوب خوب لوٹا اور اس سے اپنے گھر بھرے۔ افریقہ میں یورپ کو زیادہ دشواری شمال، شمال مغربیہ اور شمال مشرق میں پیش آئی جہاں کی آبادی مسلمان تھی۔ مسلمانانِ افریقہ یورپ کے غلام تو بن گئے لیکن یورپ کو انہوں نے کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ مہدی سوڈانی، غازی عبد الکریم اور سنوسی ایسے بطلِ جلیل ہیں جن سے یورپ لرزہ براندام رہا۔ یہ نام تاریخِ حریت کو ہمیشہ درخشندہ بنائے رکھیں گے۔ بہرحال' مسلمان علاقوں کو یورپ نے خوب ہی پامال کیا۔ یورپ کے دماغ کے خناس کا یہ عالم تھا کہ فرانس نے مثلاً' الجزائر کو اپنا مقبوضہ نہیں بلکہ اپنا صوبہ شمار کر دیا اور یوں بزعمِ خود فرانس کی حدود کو سمندر پار تک وسیع کر کے لے آیا۔ از روئے آئین' الجزائر فرانس ہی تھا۔ لیکن فرانسیسیوں اور الجزائریوں میں فرق آقا اور غلام کا تھا۔ فرانس کے آبادکار الجزائر کے تباہ کار تھے۔ وہ الجزائری زمین اور محنت کے بلا شرکتِ غیرے مالک تھے۔ دولت آفریں ہاتھ تو الجزائر کا تھا، لیکن دولت سازی کی سارت فرانس کی تھی۔ الجزائر نے اس آئینی مذاق کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور آخر کار اسے ختم کر کے دم لیا ———

سومالیہ کی مثال بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ یہ جنگجو مسلمان سومالی قوم خلیج عدن کے کنارے اور اس کے نیچے آباد ہے۔ اس کی قوت توڑنے اور اسے منتشر کرنے کے لئے اس کے پانچ حصے کر دیئے گئے۔ ایک حصہ برطانیہ کے تصرف میں تھا، دوسرا فرانس نے ہتیایا، تیسرا اٹلی نے ہڑپ کیا، چوتھا حبشہ کے تصرف میں دیا گیا اور پانچواں کینیا کا آویزہ گوش بنا۔ یہ سیاسی لکیریں یورپ نے اس انداز سے کھینچیں کہ ان کا مٹانا سنگین بین الاقوامی معاملہ بن گیا ہے۔ ....اس طرح کہ برطانوی اور اطالوی سومالیہ آزاد ہو کر ایک ملک یعنی سومالیہ بن گئے ہیں لیکن فرانسیسی سومالیہ ابھی تک غلام ہے اور فرانس، ہند چینی اور الجزائر میں ذلت آمیز شکست کھا جانے کے باوجود اس علاقے کو اپنے تصرف میں رکھنے پر مصر ہے۔ فرانس نے دوسری جنگ کے بعد خاصی عملی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ جنرل ڈیگال کا الجزائر کو آزاد کرنے پر رضامند ہو جانا ایک جرأت مندانہ اقدام تھا لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ خوشدلانہ نہیں بلکہ مجبوری کا ایسا فیصلہ تھا جس سے مفر ممکن نہیں تھا۔ یورپی ذہنیت کی دُم ہند چینی اور الجزائر کے خونیں تجربوں سے سیدھی ہو گئی ہوتی تو فرانس حال ہی میں فرانسیسی صومالی لینڈ میں اُس کردار کا مظاہرہ کرتا جو اس نے کیا۔ عالمی رائے کو یک قلم نظر انداز کر کے فرانس نے اس علاقے میں استصواب کا ڈھونگ رچا کے یہ ناقابلِ یقین نتیجہ نکالا کہ اس کے باشندے آزاد ہو کر سومالی برادری میں ملنے کی بجائے فرانس کا طوقِ غلامی گلے میں ڈالے رکھنے کے خواہشمند ہیں۔

مسلمانانِ افریقہ کا رشتہ قدرتی طور پر ایشیا سے ملتا تھا۔ اس لئے ان علاقوں نے یورپی استعمار اور استحصال کا جو مجاہدانہ مقابلہ کیا، اس میں ایشیا میں عمومی دلچسپی لی جاتی رہی اور اس کی حمایت کی جاتی رہی لیکن باقی افریقہ میں، یورپ، دنیا کی نظروں سے اوجھل، اور پوری ڈھٹائی سے غارت گری اور آدم کشی میں لگا رہا۔ ایشیا میں یورپ کی رنگ اور نسل سے مسموم ذہنیت کا کچھ کم مظاہرہ نہیں ہوا تھا لیکن افریقہ میں اس کا مظاہرہ وسیع پیمانے پر اور قدرے مختلف مگر خطرناک طریقے سے ہوا۔ اس براعظم کے جنوبی حصے میں یورپ نے سیاسی غلامی کو آباد کاری کا رنگ دیا اور "جنوبی افریقہ" کو یوں سفید فام بنا لیا کہ مٹھی بھر یورپی آباد کار پورے علاقے کے مالک بن گئے۔ اور ان کی حکومت غیر ملکی نہیں رہی بلکہ "ملکی" بن گئی۔ اس سفید فام اقلیت نے سیاہ فام اکثریت کو اپنا غلام ہی نہیں بنایا بلکہ اسے اچھوتوں کا درجہ دے دیا۔ اصل باشندوں پر زندگی کی تمام راہیں بند کر دی گئیں۔ اہلِ فرنگ نے مساوات کی ہی مٹی پلید نہیں کی، جمہوریت کی بھی تذلیل کی۔ جنوبی افریقہ اور اس کے ملحق علاقوں میں جہاں یورپی نژاد سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق آباد ہوئے، یورپ ہی کے بلند بانگ ... دعاوی کے مطابق یہ مطالبہ کیا جاتا کہ اصلی باشندوں اور آباد کاروں کو یکساں طور پر رائے کا حق دیا جائے اور سیاست اور حکومت کا مدار "ایک شخص ایک ووٹ" کے اصول پر رکھا جائے۔ اسے جمہوریت اور مساوات کے نام لیواؤں نے آج تک تسلیم نہیں کیا۔ اور وہ

معمولی اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی بھاری اکثریت پر نہ محض حکومت کرتے چلے آرہے ہیں بلکہ انہیں ناخواندہ اور قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔

اس طرح جنوبی افریقہ یورپی آبادکاروں کا وطن ہو گیا، اور حقیقی باشندے محروم الارث ہو گئے۔ جنوبی افریقہ پر یوں غاصبانہ قبضہ کر کے سفید فام قلمرو کی حدود میں اضلاع کی چالیں چلی جانے لگیں۔ جنوبی افریقہ سے متصل ایک علاقہ ہے جنوب مغربی افریقہ۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کے وقت جرمنی کا مقبوضہ علاقہ تھا۔ لیکن جرمنی کی شکست کے بعد اسے جمعیتِ اقوام نے جنوبی افریقہ کو بطور امانت دے دیا۔ جنوبی افریقہ اس علاقے کے لئے جمعیتِ اقوام کے سامنے جواب دہ تھا۔ لیکن اس لئے اسے پہلے دن سے اپنا مقبوضہ سمجھا۔ اور یورپی اقوام نے اس سے بازپرس کا کوئی موقع پیدا نہیں ہونے دیا۔ عالمی ادارے کی موت کے بعد اقوامِ متحدہ نے کئی کو جنوب مغربی افریقہ کی بازیافت کے لئے خاصے جتن کئے لیکن جنوبی افریقہ نے اس کی ایک نہیں چلنے دی اور اس کے نمائندوں کو اس علاقے میں داخل ہونے کی اجازت تک نہیں دی۔ اقوامِ متحدہ اس علاقے کی بازیافت کے لئے سنجیدہ ہوتی تو جنوبی افریقہ کو اس کی خواہش سے سرتابی کرنے کی مجال تک نہ ہوتی۔ لیکن اقوامِ متحدہ کو تو اشک شوئی مقصود تھی، وہ اب بھی کبھی کبھی دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈال دیتی ہے اور جنوبی افریقہ کو آنکھیں دکھانے لگتی ہے۔ لیکن بات عملی کارروائی تک نہیں آنے دیتی۔ اس سے بجا طور پر ایشیا اور افریقہ میں ہمہ گیر اضطراب پیدا ہوا اور ان کی طرف سے یہ مطالبہ شدّومد سے کیا جانے لگا کہ جنوبی افریقہ کو راہِ راست پر لانے اور افریقیوں سے انسانی سلوک کرنے پر مجبور کرنے کے لئے اس کا مکمل مقاطعہ کیا جائے اور اقوامِ متحدہ سے خارج کر دیا جائے۔ ایک ایسا ملک جس کی حکمتِ عملی نمایاں طور پر مسلسل جمہوریت سوز اور مساوات کش ہو، وہ اس سے کمتر سلوک کا مستحق نہیں ہونا چاہیئے۔ اور اس کی گوشمالی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیئے۔ لیکن یورپ اور یورپی ذہنیت کے مظہرِ مجسم، امریکہ نے عالمی ادارے میں یہ اودھم مچا رکھا ہے کہ چین کو تو اس بہانے اس کی مخصوص نشست پر بیٹھنے نہ دیا جائے کہ وہ عالمی ادارے کے نظم و ضبط کا پابند نہیں۔ لیکن جنوبی افریقہ مسلسل اسی ادارے کی توہین کا مرتکب ہو اور اس کی قراردادوں کو حقارت سے ٹھکراتا چلا جائے تو اس کے خلاف کسی قسم کا اقدام ارکانِ ادارہ کے عمومی تقاضے کے باوجود نہ ہونے دیا جائے۔

یہ چالیں اس لئے چلی جارہی ہیں کہ یورپی گین جنوب سے شروع ہو کر افریقہ کے زیادہ سے زیادہ حصوں پر چھاتا چلا جائے۔ چنانچہ جنوبی افریقہ سے جنوب مغربی افریقہ کو زد میں لے لیا گیا۔ حال ہی میں ان دونوں سے ملحق علاقہ آزاد ہوا ہے۔ دورِ غلامی میں اسے بچوانا لینڈ کہتے تھے اور اب یہ باٹسوانا ہے۔ یہ ملک یورپی غاصبوں سے پوری طرح گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال، مغرب، جنوب اور جنوب مشرق میں جنوبی افریقہ اور جنوب

مغربی افریقہ کے علاقے ہیں شمال مشرق میں رہوڈیشیا ہے جو نیا یورپ ہے۔ بالٹوانا کی آزادی صریح سازش ہے۔ اسے آزاد کرکے یورپی غاصبانِ افریقہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں گویا برطانیہ نے یہ ملک کا ملک غاصبوں کے حوالے کر دیا ہے لیکن اقوامِ عالم کی صف میں بیٹھ کر اپنے آپ کو شاباش دے رہا ہے اور اپنے لئے شاباش لے رہا ہے کہ اس نے ایک اور غلام ملک کا درجہ بلند کرکے آزادی سے ہمکنار کیا۔ ابھی رہوڈیشیا کا ذکر ہوا ہے۔ اس میں بھی یورپی غاصب حکومت پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ اس سے ملحق دو علاقے تھے۔ نیاسالینڈ اور شمالی رہوڈیشیا۔ دونوں میں رہوڈیشیا کی طرح غالب اکثریت افریقیوں کی ہے۔ ان تینوں علاقوں کو انگریز نے ایک وفاق میں نیاسالینڈ اور شمالی روڈیشیا کی مرضی کے خلاف جکڑ دیا تھا۔ وفاق کا نظام ایسا تھا کہ روڈیشیا (جو پہلے جنوبی روڈیشیا کہلاتا تھا) کے غاصب یورپی آبادکاروں کو پورے وفاق میں بالادستی حاصل تھی۔ اس طرح اس وسیع وعریض حصہ افریقہ کو سفید فاموں کے تصرف میں دے دینا مقصود تھا۔ وفاق کا ناہنجار اور ظالمانہ رشتہ دس سال سے زیادہ عرصہ تک برقرار رکھا گیا۔ لیکن نیاسالینڈ اور شمالی روڈیشیا کی افریقی آبادی نے اسے دل سے قبول نہ کیا اور اسے توڑنے کے درپے رہی۔ بالآخر یہ رشتہ ختم کر دیا گیا اور نیاسالینڈ اور شمالی روڈیشیا علیحدہ بھی ہو گئے اور آزاد بھی۔ بعد میں وفاق کے تیسرے جزو کی آزادی کا سوال سامنے آیا تو یورپی ذہنیت نے اپنا گل کھلایا۔ کچھ عرصہ جمہوریت اور مساوات کا زبانی خرچ خرچ رہا۔ برطانیہ نے دکھانے کے لئے خوب زور لگایا کہ روڈیشیا کی آزادی کا یہ مطلب ہونا چاہیئے، کہ وہاں کے اصلی افریقی باشندے بھی آزاد ہوں اور حکومت جمہوری اصولوں کے مطابق بنے اور اکثریت کی ہو۔ لیکن نہ برطانیہ کی خواہش دل سے ایسی تھی، نہ ان کے سفید بھائی بندوں کی ایسی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ روڈیشیا نے "بغاوت" کر دی اور سفید فام غاصبوں نے اپنی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک اور ملک کی غالب افریقی اکثریت کہنے کو آزاد ہو لیکن یورپی آبادکاروں کی ایسی بدتر غلامی کی شکار ہو جائے جس سے گلو خلاصی کی کوئی صورت دکھائی نہ دے۔ برطانیہ اس سازش کا مرکزی کردار ہے۔ اس نے غاصب بھائی بندوں کو روڈیشیا پر مسلط کرکے دولتِ مشترکہ کی کانفرنس بلائی۔ وہ غصے میں پیچ وتاب کھاتا دکھائی دیتا تھا اور ایک ایک رکن سے پوچھتا تھا کہ اس بغاوت کا کیا علاج کیا جائے۔ ارکان نے معقول اور قابلِ عمل تجاویز پیش کیں تو برطانیہ اصل رنگ میں ظاہر ہو گیا۔ اس نے کوئی ایک تجویز چلنے نہیں دی اور بات اس پر ختم کر دی کہ وہ روڈیشیا کی آزاد حکومت کو تسلیم نہیں کرے گا۔ برطانیہ اسے تسلیم کرے یا نہ کرے، روڈیشیا ایک اور یورپ بن تو گیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپ کے لئے افریقہ کو غلام بنائے رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس براعظم

کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں آزادی کی زبردست تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔ ان میں سے بعض (مثلاً کینیا میں) دہشت پسندانہ تھیں۔ اور بعض (مثلاً الجزائر میں) باقاعدہ جنگی تھیں۔ جنگ کے بعد یورپ نے کوئی دس سال اس ادھیڑبن میں گزارے کہ وہ افریقہ سے کیا سلوک کرے۔ اس تاریک براعظم کو دوسرا یورپ بنانے کے منصوبے کامیاب ہوتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ افریقہ کی آزادی کی تحریکوں میں عالمگیر دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اور یورپ کے لئے ان تحریکوں کو دبائے رکھنا اور عالمی رائے سے بچنا آسان نہیں رہا تھا۔ یورپ کے خلاف رائے کو چین کی آزادی سے خصوصی تقویت ملی اور جب ۱۹۵۵ء میں انڈونیشیا میں پہلی افریقی ایشیائی کانفرنس — بنڈونگ کانفرنس — منعقد ہوئی تو یورپ افریشیائی مزاج اور زمانے کے تیور سمجھ گیا۔ لیکن اپنی عادت کے عین مطابق اس نے زمانے کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اس رَو کو بے اثر کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

یورپ کے سامنے افریقی صورت حال یہ تھی کہ شمال میں جو مسلمان علاقے تھے وہاں یورپ نہ آبادکاروں کے مسلط رہ سکتا تھا اور نہ انہیں سیاسی غلامی میں جکڑے رکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے بڑے جتن کئے اور ان علاقوں کی آزادی کو معرضِ التوا میں ڈالنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلے۔ یہ اسے بہرحال یقین تھا کہ وہ مسلمانوں کو غلام بنا کے نہیں رکھ سکے گا۔ چنانچہ ان کے دورِ غلامی کو یہ لطائف الحیل طول دیتے ہوئے اس نے جنوب کی طرف توجہ دی۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اس نے علاقوں کے علاقے یورپی آبادکاروں کی تحویل میں دینے شروع کئے۔ یہ سیاسی غلامی سے بدتر صورت تھی لیکن یورپ نے اس کی زہرناکی کو یوں کم کرنے کی کوشش کی کہ گویا آبادکار مقامی باشندے ہیں جو اپنے اپنے ملکوں کے جائز حقدار ہیں۔ اس طرح اب تک جن ملکوں پر یورپ کی سفیدی پھیری گئی ہے، ان کے نام یہ ہیں۔ جنوبی افریقہ، جنوب مغربی افریقہ، روڈیشیا۔ ان میں سے پہلے اور تیسرے کو آزاد کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معمولی سفید فام اقلیتیں بھاری سیاہ فام اقلیتوں پر مسلط ہیں۔ یہ غیر انسانی مذاق ختم ہونا چاہیئے اور ایشیا اور افریقہ کو اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھنا چاہیئے، جب تک یہ علاقے پھر سے اصلی افریقی باشندوں کی تحویل میں نہیں چلے جاتے اور سفید فام اقلیتیں آقاؤں کے مقام سے نیچے اتر کر عام باشندوں کے برابر درجہ قبول نہیں کر لیتیں۔

یورپ کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اس طرح جنوب سے یورپی سفیدی پھیرتا چلا جائے گا اور تقریباً نصف افریقہ کو ہتھیا لے گا۔ لیکن اس کی ساری دھاندلیوں کے باوجود ایسا نہیں ہو سکا۔ شمالی مسلمان علاقے آزاد ہو گئے۔ وسطی علاقے بھی ایک ایک کر کے آزاد ہو چکے ہیں۔ اور ان میں یورپی سازشیں تو ختم نہیں ہوئیں

البتہ ان کی ناکامی مفید ہو چکی ہے۔ کانگو میں یہ سازشیں خاص طور پر بروئے کار لائی گئیں۔ یہ بدقسمت ملک بلجیم کی غلامی سے ۱۹۶۰ء میں آزاد ہوا۔ لیکن یورپی طاقتوں کا اکھاڑہ بن گیا۔ کیونکہ یورپ نہیں چاہتا تھا کہ سونے کی یہ چڑیا اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اقوام یورپ اس کی آزادی کو بے معنی بنا کے رکھ دینا چاہتی تھیں لیکن پورا زور لگانے کے باوجود ناکام ہو گئیں۔ اسی طرح کی صورت حال نائیجیریا میں ہے۔ افریقہ کے اس سب سے بڑے ملک میں یورپ ایسے عناصر کو شہ دے رہا ہے اور اس انداز سے تاریں ہلا رہا ہے کہ اس کے حصے بخرے ہو جائیں اور اس کے مسلمان عیسائیت نہ قبول کر لیں تو سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے بے اثر ہو جائیں۔

اس جائزے سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ افریقہ میں یورپ بڑی شدت اور ڈھٹائی سے مشیت سے برسرِ پیکار ہے۔ وہ مسلسل مشیت سے برسرِ پیکار رہا ہے۔ وہ یہ معرکہ جیت نہیں سکتا۔ لیکن پسپا ہو کر وہ پینترے بدلتا ہے اور مشیت کے منصوبے میں رخنے ڈالتا ہے۔ یوں بھی مشیت کے انداز ایسے ہیں کہ پسپائی کے باوجود یورپ کو ڈھیل ملتی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اسے پسپائی نہیں سمجھتا اور مشیت سے ملنے والی مہلت کو مشیت ہی کے خلاف صرف کرنے میں لگ جاتا ہے اور لگا رہتا ہے۔ اب وہ مشینی ترقی کو ایسے خوفناک مقام پر لے آیا ہے کہ زمین تو کیا فضا تک میں اس کا تسلط پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے عالم انسانی میں قدرتی طور پر دہشت پھیلتی جا رہی ہے۔ اسی لئے آج انسان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ "یورپ" ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ غیر یورپی دنیا اخلاق و اقدار کی بنیاد پر متحد ہو اور یورپ کی مشین کا جواب مشین سے دے۔ اس کے بغیر یورپ کا زور توڑنا ممکن نہیں ہوگا۔ یہ شروع تو ہو گئی ہے لیکن یورپ اس رو کو پنپنے نہیں دے رہا۔ ۱۹۵۵ء سے لے کر اب تک یہ تحریک کن مراحل سے گزری اور یورپ نے کس طرح پہلو بدل بدل کر اس کو بے اثر بنایا، اس کا مطالعہ آئندہ قسط میں کیا جائے گا۔ انشاء اللہ!

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں یہ انکا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اسکی تعلیم کیا ہے۔ اسکی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اسکا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چاروں جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ، عمدہ سفید کاغذ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ ۱۵ روپے فی جلد چوتھی جلد بارہ روپے مکمل سیٹ پچاس روپے ہیں۔

ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ بی گلبرگ ۲ - لاہور

رابطۂ باہمی

بزمِ لاہور سابقہ کنونشن اور اجتماعِ نمائندگانِ بزم ہائے طلوعِ اسلام میں طے کردہ پروگرام کیمطابق یہ بزم اپنے تمام ذرائع اور توجہ مجلۂ طلوعِ اسلام، اور متعلقہ لٹریچر کی نشر و اشاعت پر مرکوز کئے ہوئے ہے۔ ۱۰ر جون بروز ہفتہ ایک خصوصی میٹنگ محترم شیخ سراج الحق صاحب کے مکان پر منعقد ہوئی جس میں تحریک کے آرگن "طلوعِ اسلام" کی اشاعت کو مزید استوار کرنے کے ذرائع پر غور کیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ ارکانِ بزم میں انفرادی طور پر اپنے آپ کو تحریک اور اسکے پیش کردہ مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ایک سٹڈی سرکل قائم کیا جائے جس میں احبابِ بزم اپنے تاثرات پیش کر کے باہمی تنظیم و یکجہتی کی ایسا فضا پیدا کریں جو قرآنی فکر کی تخم ریزی اور آبیاری میں مفید ہو۔ ادارہ کا مرکزی درسِ قرآن اب سورۃ المنفقون اور اٹھائیسویں پارے کے دو تہائی تک پہنچ چکا ہے۔ سامعین میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ توقع کی جا رہی ہے کہ محترم پرویز صاحب کے مسلسل درس کے ختمِ قرآن کی تقریب آئندہ کنونشن کے ساتھ پیوست ہو سکے گی۔

بزمِ کراچی کی کارکردگی کی ہفتہ وار رپورٹیں، باوجود نمائندۂ بزم محترم محمد اسلام صاحب کی علالتِ طبع اور دیگر ناسازگار حالات کے حسبِ معمول آ رہی ہیں۔ سندھ اسمبلی ہال میں پرویز صاحب کا ٹیپ شدہ سلسلۂ درس اب سورۃ الحجرات (پارہ ۲۶) تک پہنچ چکا ہے۔ درس کو اور زیادہ مقبول بنانے کے لئے بزم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ہال ہی میں ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور اخباروں کے علاوہ ارکانِ بزم چھوٹے سائز کے ہینڈ بلز کے ذریعہ بھی درس اور تحریک کے لٹریچر کی اشاعت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزم و ہمت میں اضافہ فرمائے۔

دیگر بزمیں بزمہائے راولپنڈی، لائل پور، مردان، سرگودہا، گجرات، دیونہ منڈی، میانوالی، کوئٹہ و بریڈفورڈ (انگلستان) بھی اپنے اپنے حلقۂ اثر میں قرآنی نشر و اشاعت کا فریضہ انہماک سے ادا کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے ارادوں اور مساعیِ جمیلہ میں برکت عطا فرمائے۔

بابُ المراسلات

۱۔ کیا یہ جنگ جہاد ہے؟

عرب ، اسرائیل جنگ چھڑنے کے ساتھ ہی ہمارے پاس اس قسم کے "فتاوے" آنے شروع ہو گئے کہ ـــ کیا فرماتے ہیں علمائے دین، حاملانِ شرعِ متین، بیچ اس مسئلہ کے، کہ عربوں اور اسرائیلیوں کی موجودہ جنگ جہاد ہے یا نہیں .....

ہمیں ان مستفسرین کے استفسار پر تعجب نہیں، اس لئے کہ صدیوں کی مذہب پرستی نے انہیں بتایا ہی یہ ہے کہ ایسے تمام معاملات میں علمائے کرام سے فتوے لینا چاہیئے۔ ہم ان احباب اور ان کے ساتھ دیگر حضرات) کی اطلاع کے لئے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی فتاوے طلبی ہمارے اس دور کی ایجاد ہے جب مذہب اور سیاست میں ثنویت (تفریق) پیدا ہو گئی تھی۔ اس "دو مملکتی" نظام کا نتیجہ یہ تھا کہ جنگ کرنے کا فیصلہ حکومت کرتی تھی اور اسے مقدس جہاد قرار دینے کا فتوے "علمائے کرام" دیتے تھے۔ حکومت کو اس کا فائدہ یہ تھا کہ وہ اپنے ہر فیصلے کے حق میں "ضمنی سند" حاصل کر لیتی تھی۔ اور مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں، اپنی مقاصد براری کے لئے یہ بہت بڑا (LEVER) تھا ـــ جس طرح مودودی صاحب نے کشمیر کی جنگ کے متعلق یہ کہہ کر کہ وہ جہاد نہیں، ایک فتنہ کھڑا کر دیا تھا۔

اس باب میں صحیح پوزیشن یہ ہے کہ :-

(۱) جہاد کوئی فقہی مسئلہ نہیں جس کے متعلق مذہبی پیشوائیت فیصلہ کر سکتی ہے کہ فلاں جنگ 'جہاد' ہے یا نہیں ـــ جہاد کے معنی جدوجہد کرنا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے، اسلام کے استحکام اور فروغ کے لئے ہر کوشش 'جہاد' ہے۔ اس جدوجہد میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جہاں اسلامی مملکت کو، اسلام دشمن قوتوں کے خلاف جنگ بھی کرنی پڑ جاتی ہے۔ اسے قتال کہا جاتا ہے، لیکن

چونکہ یہ اُسی جدوجہد کی ایک کڑی ہوتی ہے، اس لئے قرآن کریم نے اسے جہاد سے بھی تعبیر کیا ہے۔

(۲) جب کوئی اسلامی مملکت، اسلام دشمن قوت کے خلاف، جنگ کا فیصلہ کردے تو اسے جہاد فی سبیل اللہ کہا جائے گا۔

(۳) مسلمانوں کی جو مملکت اسلامی نہ ہو، وہ اگر کسی دشمن کے خلاف اعلانِ جنگ کردے، تو اسوقت یہ سوال اُٹھانا کہ یہ جہاد ہے یا نہیں، فتنہ انگیزی ہے۔ اس مملکت کے ہر باشندے کا آئینی فریضہ ہو جاتا ہے کہ اس جنگ کی حمایت کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ رائج الوقت قوانین کی رُو سے، مملکت کا غدار قرار پاتا ہے۔ اگر وہ مملکت کسی دوسری مملکت کے ساتھ، جنگی تعاون کا فیصلہ کرتی ہے، تو اس فیصلہ کی تائید بھی اِس مملکت کے باشندوں کا آئینی فریضہ ہو جاتا ہے۔

(۴) جہاں تک مملکتِ پاکستان کا تعلق ہے، یہ مملکت، حاصل ہی اس مقصد کے لئے کی گئی تھی کہ اس میں صحیح اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ لہٰذا، اس مملکت کا تحفظ ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔ اور کوئی ایسی حرکت، جس سے اس کی سالمیت و استحکام کو ضعف پہنچتا ہو، نہ صرف آئینی غداری ہے بلکہ دین کی رُو سے بھی جرمِ عظیم ہے۔ اگر یہاں کی حکومت، مملکت کے کسی دشمن کے خلاف جنگ کا اعلان کرتی ہے، تو وہ جنگ، قرآنی جہاد ہوگی۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جنگ کی صورت میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ علمائے کرام سے فتوے طلب کئے جائیں کہ اس میں شرکت "جہاد" ہے یا نہیں۔ حکومت کا فیصلہ وہ "فتویٰ" ہے جس کے بعد کسی اور کے فتوے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب تک ذہنوں میں یہ بات صاف نہیں ہوگی مولوی صاحبان کے ہاتھ میں "فی سبیل اللہ فساد" برپا کرنے کا حربہ موجود رہے گا۔ کیا یہ پوزیشن بالبداہت مضحکہ انگیز نہیں کہ جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تو ایوانِ حکومت میں ہو اور اسے جائز یا ناجائز قرار دینے کا فیصلہ مساجد کے حجروں میں کیا جائے۔ ذرا سوچئے، کہ اگر ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مولوی صاحبان یہ فیصلہ فرما دیتے کہ چونکہ اس جنگ میں فلاں فقہی شرط پوری نہیں ہوتی، اسلئے اسے جہاد نہیں قرار دیا جا سکتا، تو اس ملک کی حالت کیا ہوتی؟

لہٰذا ہم مملکتِ پاکستان کے باشندوں سے گزارش کریں گے کہ وہ ایسے وقت میں، مولوی صاحبان سے جہاد کے فتوے طلب کرنے نہ شروع کر دیا کریں۔ اس سے خواہ مخواہ انتشار کے امکانات اُبھر آتے ہیں۔

۲۔ تقسیم ملک کا نظریہ

سوال:۔۔۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کی تجویز علامہ اقبالؒ سے پہلے اور لوگوں نے بھی پیش کی تھی۔ اس لئے اس کا (CREDIT) انہیں نہیں جاتا۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب:۔۔۔ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ تقسیم ہند کی تجویز سب سے پہلے کس نے پیش کی تھی۔ اور کس کس کی طرف سے اس کی تائید ہوئی تھی۔ لیکن ایک حقیقت ایسی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ یہ کہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، یہ بات سب سے پہلے علامہ اقبالؒ ہی کی طرف سے سامنے لائی گئی تھی، کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات کی حیثیت سے اسی صورت میں متشکل ہو سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اس لئے ہندوستان میں، اسلام کے بطور نظامِ حیات احیاء کے لئے لاینفک ہے کہ ملک کو تقسیم کر کے، مسلمانوں کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین الگ کر دیا جائے۔ اگر اس سے پہلے کسی نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تھی تو اس نے اسے ایک سیاسی مصلحت کی بنا پر پیش کیا ہوگا۔ اسے ایک دینی تقاضے کے طور پر سب سے پہلے اقبالؒ ہی نے پیش کیا تھا۔ اور اس کا (CREDIT) ہی کو جاتا ہے۔

جہاں تک ایک سیاسی حل کے طور پر تقسیم کی تجویز کا تعلق ہے، اسے اس سے بہت پہلے لالہ لاجپت رائے جیسے کٹر ہندو نے بھی پیش کیا تھا۔ لیکن یہ ایک عجیب ماجرائے دلخراش اور حدیثِ دلسوز ہے، کہ جب اقبالؒ نے اس تجویز کو پیش کیا تو علمائے کرام کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ ان سے اس کی توقع تو بے شک نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کے دینی تقاضے کو سمجھ سکتے، لیکن حیرت تھی کہ میدانِ سیاست میں اس قدر سرگرمی سے حصہ لینے کے باوجود، ان میں ایک ہندو جتنا سیاسی شعور بھی نہیں تھا۔ جہاں تک ان لوگوں کا سیاسیات میں حصہ لینے کا تعلق ہے، اس گروہ کے ایک بہت بڑے نمائندہ، مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے اعلان کیا تھا کہ ان لوگوں کا مقصود، ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا ہے۔ انہوں نے کبھی بھی اس مقصد کے لئے جنگِ آزادی نہیں لڑی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے۔ اس لئے، ان کے نزدیک، ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے کی تجویز بڑی ناپاک تھی۔۔۔ وہ تو ایک طرف رہے، مودودی صاحب وہاں برملا کہتے رہتے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا، دین کے تقاضے کی حیثیت سے، ملک کی تقسیم کے مطالبہ کا سہرا اقبالؒ ہی کے سر بندھتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ایسی بات اسی شخص کے ذہن میں آسکتی تھی جس کا سیاسی شعور، قرآنی راہ نمائی کا پیدا کردہ ہو۔

۲۔ اسلامی جمہوریت

سوال:۔ مودودی صاحب آج کل ہر جگہ "اسلامی سوشلزم" کی مخالفت کرتے اور اسے یکسر خلافِ اسلام بتاتے ہیں۔ اور اسلامی جمہوریت کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ "اسلامی سوشلزم" کیا ہے اور اسلامی جمہوریت کیا؟

جواب:۔ ان سوالات کا جواب آپ کو مودودی صاحب سے دریافت کرنا چاہئیے تھا۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، طلوعِ اسلام کے صفحات میں سوشلزم اور جمہوریت دونوں کے متعلق متعدد بار بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی جا چکی ہے۔

"اسلامک سوشلزم" کے جن داعیان کے خیالات معلوم کرنے کا ہمیں موقعہ ملا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کو اختیار نہیں کرنا چاہتے، جو خدا کے انکار پر مبنی ہے۔ اس کی جگہ ہم اپنا اسلامی فلسفۂ زندگی ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ البتہ سوشلزم کا معاشی نظام اپنانا چاہتے ہیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ملک کے ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت کے بجائے، مملکت کی اجتماعی تحویل میں رہنے چاہئیں۔ تاکہ ان سے افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریات پوری کی جاسکیں۔

ہمارے نزدیک اس قسم کا معاشی نظام، نہ صرف یہ کہ خلافِ اسلام نہیں، بلکہ قرآن کا تقاضا ہے۔ اور ہم اسی کی طرف شروع سے دعوت دیتے چلے آرہے ہیں۔ مودودی صاحب اگر اسے خلافِ اسلام سمجھتے ہیں تو یہ ان کا اپنا خیال ہے۔ وہ اسے صحیح سمجھا کریں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جمہوریت کے ساتھ ...."اسلام" کا پیوند لگاتے ہیں، وہ کسی طرح لگ بھی سکتا ہے؟ آپ پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جمہوریت کہتے کسے ہیں۔ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ کسی ملک کے باشندوں کو اس بات کا کلی اور آخری اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے جس قسم کا نظام جی چاہے وضع کریں۔ اور جس قسم کے قوانین مناسب سمجھیں مرتب کریں۔ ان کے اس فیصلے کو کہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر، مملکت میں اقتدارِ کلی (Sovereignty) قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ جمہوریت کا یہ وہ مفہوم ہے جو خود جماعت اسلامی کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔

چنانچہ ان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے ابھی چند دنوں پہلے (مئی میں) جو قرار دادیں پاس کی ہیں، ان میں سے ایک میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ

> بحالی جمہوریت کے معنی ہی یہ ہیں کہ باشندگانِ ملک کو خود اپنی مرضی سے اپنی پسند کا نظام اور پسند کے حکمران منتخب کرنے کی آزادی حاصل ہو۔

ایک اور قرار داد میں یہ کہا گیا ہے کہ

> ہر شخص اور ہر گروہ یہ حق رکھتا ہے کہ جمہوری و آئینی طریقوں سے رائے عامہ کو اپنے نقطۂ نظر کے حق میں ہموار کرے۔ اور جمہوریت کا راستہ یہی ہے کہ ملک کے باشندے ہر ایک نقطۂ نظر سے واقف ہونے کے بعد کثرت رائے کے ساتھ جس نقطۂ نظر سے بھی اتفاق کریں وہ کسی رکاوٹ کے بغیر برسرِ اقتدار آجائے۔ اس جمہوری عمل میں جو شخص بھی رکاوٹ ڈالتا ہے خواہ وہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوششوں پر بے جا پابندیاں عاید کرنے کی شکل میں ہو یا اکثریت کی تائید حاصل کرنے والوں کے برسرِ اقتدار آنے میں مزاحمت کی نوعیت رکھتی ہو، ــــ بہر حال ایک شدید اخلاقی جرم اور ملک و قوم کے ساتھ غداری ہے جس سے ہر شخص کو باز رہنا چاہیئے۔ اور قومی زندگی کے لئے تمام عناصر کا یہ متفقہ عزم ہونا چاہیئے کہ وہ ملک میں اس قسم کی کسی تدبیر کو چلنے نہ دیں گے۔ (ایشیا ۔ ۵ مئی ۶۷ء)

آپ نے جمہوریت کا مفہوم خود جماعتِ اسلامی کے الفاظ میں دیکھ لیا۔ آپ سوچئے کہ اس میں اور سیکولر نظامِ جمہوریت میں کچھ بھی فرق ہے؟ اُس نظام کے مدعی بھی یہی کہتے ہیں کہ قوم کی اکثریت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس انداز کا نظام چاہیں، اختیار کر لیں۔ اگر مودودی صاحب کے تصور کے مطابق یہاں جمہوری نظام رائج ہو جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (مثلاً) کمیونسٹوں کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے فلسفۂ زندگی کی عام تبلیغ کریں، اور رائے عامہ کو اس کے مطابق ہموار کر لیں۔ اس کے بعد اگر اُن کے ہم خیالوں کی اکثریت ہو جائے تو انہیں اس کا حق ہوگا کہ وہ ملک میں خالص کمیونزم کا نظام قائم کر لیں۔ اگر جماعت اسلامی (یا کوئی اور جماعت) اس میں کسی قسم کی مزاحمت کرے گی تو اسے "اخلاقی جرم اور قوم کے خلاف غداری" قرار دیا جائے گا۔

آپ ان حضرات سے پوچھئے کہ جمہوریت کا جو تصور آپ نے پیش کیا ہے اس میں وہ کونسی بات ہے جس کی بنا پر آپ اسے "اسلامی جمہوریت" قرار دے کر، غیر اسلامی جمہوریت سے متمیز کرتے ہیں؟

"جمہوریت" کی الگ الگ قسمیں ہوتی ہی نہیں۔ یہ ایک سیاسی نظامِ حکومت کا نام ہے جو اپنی اصل وبنیاد کی رُو سے یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام میں، اکیا ون کی اکثریت تو ایک طرف، قوم کی سو فیصد آراء ۔۔۔ بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کی متفقہ آراء کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی ایسا قانون مرتب کر سکے جو خدا کی کتاب کے خلاف ہو۔ اسلام میں اقتدارِ اعلےٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ اکثریت کی آراء کو ۔۔۔ دیکھئے قرآن کریم نے دو آیات میں اپنے نظام، اور نظامِ جمہوریت کے تقابل سے کس طرح مؤخر الذکر کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ سورۃ انعام میں ہے:

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ

وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی بات (ضابطۂ قوانین)، صدق وعدل کے ساتھ مکمل ہوگئی۔ ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی کتاب اللہ کے قوانین واحکام، مکمل بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ اس کے بعد ہے۔

وان تطع اكثر من فى الارض يضلوك عن سبيل الله ۔ وان

يتبعون الا الظن ۔ وان هم الا يخرصون ۔ (۶/۱۱۷)

اور اگر تو ساکنانِ کرۂ ارض کی اکثریت کا اتباع کرنے لگا، تو وہ تجھے خدا کے راستے سے بھٹکا دینگے وہ صرف ظن وقیاس کا اتباع کرتے ہیں اور محض انکلیں دوڑاتے ہیں۔

ان آیات کی تفسیر میں خود مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ۔

کسی طالبِ حق کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ دنیا کے بیشتر انسان کس راستے پر جارہے ہیں۔ بلکہ اسے پوری ثابت قدمی کیساتھ اس راہ پر چلنا چاہیئے جو اللہ نے بتائی ہے، چاہے اس راستے پر چلنے کیلئے وہ دنیا میں اکیلا ہی رہ جائے۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اول ص۵۷۹)

آج مودودی صاحب کے اسلام کا فتویٰ یہ ہے کہ ملک کی جو پارٹی اکثریت حاصل کرلے، اسے حق اقتدار حاصل ہے۔ لیکن کسی زمانے میں انہی مودودی صاحب کے اسلام کا یہ فیصلہ تھا کہ

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ "سوادِ اعظم کا ہمیشہ ساتھ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے، اسکے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کیساتھ

رہنے کا حکم دیا ہے، اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جنکے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اسکے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر جمی نہیں رہ سکتی۔ اس بنا پر حضورؐ نے سواد اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی ہے مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہیں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو، ان کے ہلڑ کا نام ہرگز اسلامی سواد اعظم نہیں ہے، نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے، نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُو سے امارت ہے، نہ ان کی اس امارت کو کو کسی حیثیت سے سمع وطاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ مسلمان سے جو لوگ دھوکا کھا کر جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی، ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ص ۴۲)

لیکن یہ "اسلام" اُس زمانے کا ہے جب (تقسیم سے پہلے) مسلمانوں کی اکثریت قائداعظمؒ کے ساتھ تھی اور مودودی صاحب اکیلے اپنی الگ ڈفلی بجا رہے تھے۔ اصل یہ ہے کہ ان صاحب نے اپنے تھیلے میں اسلام کے ہر قسم کے (BRANDS) رکھ چھوڑے ہیں۔ جس قسم کا مصلحتِ وقت کا تقاضا ہو، اس کے مطابق اسلام اس جھولے سے نکل آتا ہے۔

ان کا یہ اسلام پھر بھی اکثریت و اقلیت کی مصلحتی گردش کے چکر کاٹتا ہے، لیکن ان کے تھیلے میں ایک اور اسلام بھی ہے، جب وہ سر نکالتا ہے تو پورے جلال سے پکارتا ہے۔ کہ اس اکثریت و اقلیت کے پھیر میں کیا الجھ رہے ہو،

> تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو۔ لڑکر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات ص ۳۲۵)

"اسلامی جمہوریت" کی ایک تعبیر یہ بھی ہے:۔

سوال میں یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ مودودی صاحب کی تضاد بیانیاں اور رنگ تبدیلیاں آئے دن بے نقاب ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ ان کے باوجود ان کی جماعت کے لوگ ان کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور عوام ان کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔

جہاں تک جماعتِ اسلامی کے ارکان کا مودودی صاحب کے ساتھ چمٹے رہنے کا تعلق ہے، اس

کی وجہ ظاہر ہے۔ ان میں سے قریب ایک تہائی تنخواہ دار ملازم ہیں۔ یہ مفاد عاجلہ حاصل کر رہے ہیں۔ باقی اس توقع میں ہیں کہ جب حکومت اس جماعت کے ہاتھ میں آئے گی تو سب سے بڑا حصہ انہی کو ملے گا۔

باقی رہے عوام، سو اس کے لئے اس جماعت نے بڑی کامیاب ٹیکنیک اختیار کر رکھی ہے۔ انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں جب تحریکِ آزادی اٹھی ہے تو اس وقت صورت یہ تھی کہ جو شخص حکومت کو زیادہ سے زیادہ گالیاں دیا کرتا، وہ عوام میں بڑا ہر دلعزیز ہو جاتا۔ (اور جس کے متعلق یونہی افواہ اڑا دی جاتی کہ وہ سرکار کا خیر خواہ ہے، اسے "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کا "سیاپا" کھا جاتا)۔ انگریز چلا گیا۔ غیروں کی حکومت ختم ہو گئی — اب مملکت بھی اپنی ہے اور حکومت بھی اپنی — لیکن اس تبدیلی کے باوجود عوام کی وہ ذہنیت ابھی تک بدستور چلی آ رہی ہے۔ جماعت اسلامی عوام کی اسی ذہنیت سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اس کی ہر دلعزیزی کا راز صرف یہ ہے کہ یہ حکومت کو برابر گالیاں دیتی رہتی ہے — موجودہ حکومت ہی کو نہیں، پہلے دن سے ہر اس حکومت کو جس نے ان کی کوئی بات نہیں مانی — اگر یہ آج حکومت کو گالیاں دینا بند کر دے تو اس کی ساری شہرت ختم ہو جائے — شہرت کیا، اس کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ اس نے اس بیس برس میں کوئی تعمیری کام کر کے نہیں دکھایا، جس کی وجہ سے عوام کے دل میں اس کی قدر ہو۔ اس کے اعمال نامہ میں تخریب، انتشار فساد کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔

یہ ہے عوام میں اس کی شہرت کا راز — حکومت کو گالیاں اور اس کے لئے وسوسہ انگیزی کا منظم منصوبہ (WHISPERING CAMPAIGN) — آپ اس جماعت سے متعلق یا متاثر کسی شخص کے پاس گھنٹہ بھر بیٹھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مسلسل باتیں کرتا جائے گا۔ ان میں (اپنوں کے سوا) کسی کے لئے تعریف کا ایک لفظ نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس، دوسروں کی تنقیص، تذلیل، تحقیر، تنقید کا رٹا ہوا سبق ہوگا جسے وہ فر فر پڑھتا چلا جائے گا۔ اس سے الگ ہو کر آپ ان کے کسی دوسرے فرد سے ملئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہی کچھ وہ بھی کہتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ اس کی زبان بھی وہی ہوگی، الفاظ بھی وہی۔ آپ کسی ناواقف آدمی سے دس منٹ تک بات کیجئے، آپ کو اس کی گفتگو سے معلوم ہو جائیگا کہ وہ جماعت اسلامی سے متعلق یا متاثر ہے۔

یہ ہے ان کی ٹیکنیک عوام کی نظروں میں جاذب بننے کی۔

حقائق و عبر

۱۔ انہی سے ہمارا نام روشن ہے!

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، محترم حمید احمد خاں صاحب حال ہی میں ترکی کا دورہ کر کے واپس تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے یونیورسٹی کے نیو کیمپس میں، یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کے ایک اجتماع میں اپنے دورے کے تاثرات بیان فرمائے۔ ان میں ایک "یادگار" واقعہ جریدۂ امروز بابت ۳۱-۵-۷۶ کے الفاظ میں یہ بھی تھا۔

> وزارتِ خارجہ کے ایک اہلکار نے انقرہ میں غالباً پروٹوکول کے تقاضوں کے پیشِ نظر پروفیسر حمید احمد خاں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دعوت دی جو بدقسمتی سے بے نوشی کی ضیافت تھی۔ مہمانِ خصوصی شربت کا گلاس ہاتھ میں لئے اور اپنی طبیعت پر جبر کئے تین گھنٹے تک ٹہلتے رہے۔ بیشتر مہمانوں نے شراب پی، لیکن اس پارٹی میں جو دو اصحاب "آؤٹ" ہوئے وہ دونوں پاکستانی سفارتخانے کے ارکان تھے۔ وہ نہ صرف آؤٹ ہوتے بلکہ اس ہذیانی کیفیت میں انہوں نے میزبان کو بھی ہراساں کیا۔ ان میں سے ایک پروفیسر حمید احمد خاں کو خطاب کر کے لکنت زدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "مسٹر وائس چانسلر! آپ کا میزبان اصل ترک نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں، میں آپ کو اصل ترکوں سے ملاؤں گا اور آپ فرق محسوس کریں گے"۔ پارٹی ختم ہوئی تو سب لوگ بقائمی ہوش و حواس اپنے گھروں کو سدھارے لیکن پاکستان کے دونوں نمائندوں کو جسمانی طور پر اٹھا کر ان کے گھروں تک پہنچانا پڑا۔

آپ نے غور فرمایا کہ غیر ملکوں میں ہمارے نمائندے، ہماری اسلامی مملکت کا نام کس طرح روشن کر رہے ہیں!

۲۔ قابلِ اعتراض لٹریچر

سُنا ہے کہ حکومت میں ایک محکمہ ایسا بھی ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ ملک میں کسی قابلِ اعتراض

لٹریچر کی اشاعت نہ ہو۔ اس محکمہ کی حسنِ کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ ایک کتاب باہر سے آتی ہے یا ملک کے اندر شائع ہوتی ہے۔ اس کی کاپیاں عام بک سٹالوں پر دھڑا دھڑ بکتی ہیں۔ ایک ایک گھر میں پہنچ جاتی ہیں۔ جتنا زہر وہ پھیلانا چاہتی ہے، پھیلا چکتی ہے، تو اس کے بعد اس محکمہ کی مشینری میں جنبش آتی ہے ــــ خود جنبش آتی ہے یا اسے جنبش دی جاتی ہے ــــ اس کتاب کے خلاف چرچا ہوتا ہے (تاکہ جتنی کتابیں باقی رہ گئی ہیں وہ بھی بک جائیں اور پہلے سے زیادہ قیمت پر بک جائیں) اس کے بعد سنا جاتا ہے کہ وہ کتاب ضبط کر لی گئی ہے۔ حالانکہ ضابطہ کی رو سے، باہر سے آنے والے ہر لٹریچر کی پڑتال ساحلِ سمندر پر ہو جاتی ہے، اور ملک کے اندر شائع ہونے والی ہر کتاب اور رسالہ کی کاپیاں براہِ راست پریس سے حکومت کے محکمہ میں بھیجی جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب کوئی کتاب یا میگزین ساری فضا کو مسموم کر چکتی ہے تو اس کے بعد اسے ضبط کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؛ جہاں تک فحش لٹریچر کا تعلق ہے، وہ ملک میں اس قدر عام ہو رہا ہے کہ کوئی نوجوان ہی ایسا ہوگا جس کے ہاتھ میں اس قسم کی اخلاق سوز اور حیا فراموش کتاب یا میگزین نہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقیات کے معاملہ میں اربابِ متعلقہ کے پیمانے بہت وسیع ہیں، اور اس میں جب سینما کی فلموں کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو پھر اس بادۂ حیا سوز کی سہ آتشگی کا کیا پوچھنا ــــ اور سنا ہے کہ ملک میں، فلموں کو سنسر کرنے کے لئے بھی بورڈ تعینات ہیں۔ غالباً وہ "بلیک بورڈ" ہیں۔

۲۔ توکّل علی اللہ

لائل پور سے شائع ہونے والے ہفتہ وار "المنبر" کی ۹ جون کی اشاعت میں مولانا غلام رسول (قلعے والے) مرحوم کے کوائفِ حیات شائع ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے باکمال موحد بزرگ تھے۔ ان کا ایک واقعہ یوں درج ہے کہ وہ اکثر تبلیغی دوروں پر باہر تشریف لے جاتے اور مہینوں بعد گھر کی طرف لوٹتے۔

> ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولوی صاحب چار پانچ مہینے کے مذکورہ قسم کے تبلیغی دورے پر سے گھر واپس تشریف لائے تو بیوی نے کہا کہ اگر گھر میں بھینس نہ ہوتی جس کے دودھ وغیرہ سے ہماری بسراوقات اور گزارہ ہوا ہے تو ہم تو بھوکوں مر جاتے۔ آپ نے اسی وقت قصائی کو بلایا بھینس کو ذبح کرایا، گوشت گاؤں میں تقسیم کرا کر خود پھر سفر کو نکل گئے۔ چار پانچ مہینے کے بعد آئے تو گھر والوں کو خیر و عافیت دیکھا۔ تو بیوی سے کہا کہ تمہارا خدا تو میں ذبح کر گیا تھا۔ اب تمہارا گذارا کیسے ہوا۔

یہ بزرگ بھی "موحد" تھے اور المنیر کا مسلک بھی (غالباً) اہلحدیث کا ہے۔ کیا ہم اس جریدہ سے اتنا دریافت کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ عمل کونسی سنت رسول اللہ کے مطابق تھا؟ اُس رسولؐ کی سنت کے مطابق جن کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جب ایک بدو اپنا اونٹ باہر چھوڑ کر حاضر خدمت ہوا تو حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اونٹ کا کیا کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے اسے خدا کے توکل پر باہر چھوڑ دیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اعقل و توکل — جاؤ — پہلے اونٹ کو رسّی سے باندھو اور پھر خدا پر توکل کرو —

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند!

اس کے جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ میاں! یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں، ان کے اتباعِ سنت کے پیمانے کچھ اور ہوتے ہیں۔ ان کے برگِ حشیش، شاخِ طوبیٰ سے اترتے ہیں۔

۴۔ نیا جال لائے .. .. ..

آئندہ الیکشن کی تیاریوں کے سلسلہ میں جماعت اسلامی نے اب (شہروں سے آگے بڑھ کر) دیہات کے کاشتکاروں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ان کے ہاں ایک زرعی کانفرنس منعقد ہوئی ہے جس میں بہت سی قرار دادیں منظور کی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر قرار داد میں، کسی نہ کسی انداز میں حکومت کو مجرم ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے اور کاشتکاروں کو باور کرایا گیا ہے کہ ان کے تمام مصائب و مشکلات کی ذمہ دار موجودہ حکومت ہے (اور ان کی مسیحا جماعت اسلامی) — ان خرابیوں کا اصل الاصول "زمین کی نامنصفانہ تقسیم" کو قرار دیا گیا ہے جس کی رُو سے بڑے بڑے زمینداروں کے پاس اتنے اتنے رقبے ہیں اور بچارے کاشتکاروں کو گذارہ کے مطابق بھی زمین کا ٹکڑہ نہیں ملتا۔

کاشتکاروں کو یہ کچھ اس جماعت اسلامی کی طرف سے باور کرایا جا رہا ہے جس نے ملک میں زرعی اصلاحات کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی، اور جن کے امیر کی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" نظام زمینداری کے حق میں "شرعی فتوے" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ شریعت حقہ کی رُو سے یہ قطعاً ناجائز نہیں کہ ایک فرد اپنے قبضے میں ہزاروں ایکڑ زمین لے آئے۔ اور حکومت کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ ان کے رقبوں کی تحدید کرے — ایک طرف زمینداروں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی جاتی ہے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری تمام مصیبتوں کا باعث زمین کی نامنصفانہ تقسیم ہے جس کی ذمہ دار حکومت ہے۔

سیاست میں سب کچھ روا ہے — اور جب یہ کچھ خدا اور رسولؐ کے نام اور اقامتِ دین کے دعویٰ کے

ساتھ کیا جاتے تو اس کے جہاد ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے !

۵۔ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے

روزنامہ امروز (لاہور) کی ۱۴ر جون کی اشاعت میں، پاکستان قومی اسمبلی کی ۱۳ر جون کی نشست کی جو روئیداد شائع ہوئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ

بجٹ پر بحث کے دوران کونسل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری مسٹر ابوالقاسم نے حکومت سے اپیل کی، کہ وہ چین کی دوستی پر اعتماد کرنے کی بجائے ہندوستان سے تعلقات خوشگوار اور بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اسلحہ بندی کی دوڑ میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ ہماری ترقی کے لئے امن کی اشد ضرورت ہے اور پاکستان اور ہندوستان کے عوام کا مفاد امن اور دوستی میں مضمر ہے۔

مسٹر قاسم نے امریکہ کی جانب سے ہندوستان کی حمایت کو حق بجانب قرار دیا اور کہا کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم ایک کمزور اور چھوٹی قوم کی حیثیت سے معرضِ وجود میں آئے تھے لہٰذا چین جیسے بڑے ملک پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اسرائیل اور عربوں کی حالیہ جنگ میں روس کا کردار بھی دیکھ لیا ہے۔ چنانچہ اب ہم اس ملک پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اگر کوئی شخص دیانت داری سے یہ رائے رکھتا ہے کہ پاکستان کی بہبود فلاں ملک کے ساتھ خوشگوار تعلقات سے وابستہ ہے، تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کہنا کہ "امریکہ ہندوستان کی حمایت کرنے میں حق بجانب ہے"۔ اور۔ "ہمیں اسلحہ بندی کی دوڑ میں حصہ نہیں لینا چاہیئے"۔ پاکستان کے کسی بھی خواہ کو کیسے زیبا دے سکتا ہے؟ اور پھر یہ دلیل کہ "ہم ایک کمزور اور چھوٹی قوم کی حیثیت سے معرضِ وجود میں آئے تھے لہٰذا ہم چین جیسے بڑے ملک پر بھروسہ نہیں کر سکتے" (ہمیں امریکہ اور ہندوستان جیسے "چھوٹے چھوٹے" ملکوں پر ہی بھروسہ کرنا چاہیئے) جس قدر لودی ہے کہ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اسمبلی میں اس کا کسی نے جواب دیا یا نہیں، یہ ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ لیکن حیرت ہے، کہ پاکستان مسلم لیگ بھی اس قسم کی باتوں کو سنتی ہے اور خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ اس نے تو (ہماری معلومات کے مطابق) احزابِ مخالف کے تازہ منشور تحریکِ جمہوریت کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ حالانکہ وہ منشور پاکستان

کی سالمیت کے خلاف ایک شدید خطرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اور اس دپاکستان مسلم لیگ نے نو عرب، اسرائیل جنگ کے دوران بھی لب کشائی نہیں کی۔ انہوں نے غالباً سعدی کی اس نہایت تجربہ کارانہ نصیحت کو بڑی مضبوطی سے پلّے باندھ رکھا ہے کہ ؎

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد!
عیب و ہنرش نہفتہ باشد!

۶۔ پریسیٹ ہُڈ کے خطرہ کا احساس

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ترجمان، ماہنامہ فکر و نظر کی اشاعت بابت جون ۱۹۶۷ء کے "نظرات" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

[" پاکستان اس وقت جس مرحلے سے گزر رہا ہے، اس میں یہاں کی قومی قیادت کو جس کی فعّال مظہر ایک آزاد ملک میں قدرتاً اس کی حکومت ہی ہوتی ہے، آج یہ مسئلہ درپیش ہے کہ وہ نظم و نسق حکومت اور قانون سازی میں، ظاہر ہے اسلام کے بنیادی اصولوں اور اس کی ابدی و عمومی تعلیمات کو اپناتے ہوئے، ملک و قوم کی ضرورتوں اور موجودہ زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھے، یا ان علماء کو ان تمام معاملات میں حق استرداد (ویٹو) دیدے جن کے نزدیک —

> "اسلامی اصول اور اسلامی احکام کی تشریح و توضیح میں رائے عامہ یا حکام کی مرضی کو مطلق کوئی دخل نہیں ہے۔ ماہرین علوم شریعت کا قول قولِ فیصل ہے اور ان کی رائے آخری رائے ہے"

اس مسئلے کا دو ٹوک فیصلہ کرنا آج ضروری ہو گیا ہے۔ اور اس میں جتنی تاخیر ہوگی، پاکستان کے اتحاد، استحکام، اور ترقی پر اس کا بُرا اثر پڑے گا۔ اور ملک کے لئے اندرونی اور بیرونی خطرات بڑھیں گے۔

اس مکتب خیال کے علماء ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ "اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور وہ زندگی کے تمام شعبوں کی صورت گری کرتا ہے" اور دوسری طرف ان کا مطالبہ ہے کہ "اسلامی اصول اور اسلامی احکام کی تشریح و توضیح کے بارے میں" ماہرینِ علومِ شریعت کا قول قولِ فیصل ہے اور ان کی رائے آخری رائے ہے؟

گویا عملاً "اولوالامر" حکومت نہیں، جس کے خلاف سیاسی و قانونی جد و جہد بھی ہو سکتی ہے اور اسے

بدلا بھی جا سکتا ہے، بلکہ "ماہرینِ علومِ شریعت" ہیں، جن کی رائے آخری رائے ہے اور مزید دقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو خود کو عالم کہے، یا دوسرے اُسے عالم سمجھیں، "ماہرینِ علومِ شریعت" میں سے ہونے کا مدعی ہے۔ اور حکومت کا ہر معاشی و انتظامی اقدام خواہ وہ کتنا بھی جزوی کیوں نہ ہو، ان "ماہرینِ علومِ شریعت" کے لئے اسلامی اصول اور اسلامی احکام میں داخل ہے۔

یہ ہے وہ سنگین صورتِ حال جو آج اس ملک کو درپیش ہے اور ہمارے خیال میں اس کا فیصلہ زیادہ دیر معرضِ التوا میں نہیں رکھا جا سکتا۔"]

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ طلوعِ اسلام جس آواز کو گزشتہ بیس سال سے مسلسل و پیہم بلند کئے چلا آرہا ہے، اس کی صدائے بازگشت اب ان حلقوں سے بھی سنائی دینے لگی ہے۔ خدا کرے کہ ملک کے دیگر اربابِ نطق بھی اس خطرہ کے خلاف لب کشائی کریں اور جو کچھ وہ دل میں محسوس کرتے ہیں اسے زبان تک لے آنے کی بھی ہمت کریں۔ اسی سے یہ خطرہ ٹل سکتا ہے۔

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کرلیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائینگے۔ وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپ کو بھیج دی جائے گی۔ رسالہ طلوعِ اسلام کا چندہ بھی اسی سے وضع کرلیا جائے گا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔

(ناظم - ادارہ طلوعِ اسلام)

ہماری صنعتی ترقی اور

نیلم نائلن

نیلم نائلن خالص پاکستانی پیش کش ہے۔
ملک کو صنعتی ضروریات میں خود کفیل بنانے اور قومی زرمبادلہ بچانے کیلئے
نیلم نائلن کا کردار ہمیشہ قابلِ فخر رہیگا!

نیلم نائلن کی مصنوعات کو ہمیشہ ترجیح دیجئے

نیلم یارن ——— پارچہ بافی کے لئے
نیلم ٹوائن ——— مچھلی پکڑنے کے جالوں کیلئے۔
نیلم مانوفلیمنٹ ——— مچھلی پکڑنے کی ڈوری، ٹینس اور بیڈمنٹن کے بلوں کی کٹ۔ برشوں کے بال اور لاتعداد دوسری اشیاء کے لئے۔
نیلم نائلن چپس ——— مشینی پرزوں۔ گیئر، بشنگ اور کاروں کے فاضل پرزوں کیلئے۔

فضل نائلن ملز لمیٹڈ۔ لائلپور۔ فون ۲۰۸۰، ۲۷۴۴، ۳۲۴۲

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

کراچی - سندھ اسمبلی ہال نمبر وسعید منزل۔ بندر روڈ
ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے

لاہور - ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ ہر اتوار کی صبح ۸ بجے

ملتان - میسرز شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ
ہر جمعہ - بعد نماز مغرب۔

لائلپور - پنجاب ڈیریز ۔ ۸۰۔ ۴ اے پیپلز کالونی
ہر جمعہ بعد نماز مغرب

سرگودہا - ۲۵ نیو سول لائن کوارٹر ۳۔ ہر اتوار ۶ بجے شام

انگلستان - بزم طلوع اسلام ۲۰۰ اسالٹ سٹریٹ بریڈ فورڈ ۸ کے زیر اہتمام یہ درس ہر اتوار کی صبح دس بجے نشر ہوتا ہے۔ بریڈ فورڈ سے باہر رہنے والے احباب نمائندہ بزم کو مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھ کر ٹیپ بھی منگوا سکتے ہیں۔

راولپنڈی - الکوثر بلڈنگ متصل زنانہ کالج مری روڈ - ہر جمعہ ۴ بجے شام

لیہ - مقبل ہوٹل۔ نزد ریلوے اسٹیشن۔
ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ۔

طلوعِ اسلام کی کتابیں اور ماہنامہ طلوعِ اسلام

یہاں سے بھی مل سکتے ہیں!

لاہور۔ (۱) انٹرنیشنل بک سروس .. ۷۵ دی مال لاہور
(۲) کلاسیک بک سیلرز .. .. ۴۲ دی مال "
(۳) پیپلز پبلشنگ ہاؤس .. ۲۶ دی مال "
(۴) کواپریٹو بک شاپ .. .. ۷۰ دی مال "
(۵) لاہور بک ڈپو .. .. ۷۵ دی مال "
(۶) بک سنٹر .. .. چوک ریگل دی مال "
(۷) ادبستان .. .. چوک ٹکسالی ۔ لاہور
(۸) آئیڈیل بک ہاؤس .. ۱۹۴ انارکلی "
(۹) مکتبہ پاکستان .. چوک انارکلی "
(۱۰) گوشۂ ادب .. .. چوک انارکلی "
(۱۱) اسمٰعیل اینڈ برادرز .. چوک انارکلی "
(۱۲) نیشنل بک سٹال .. چوک انارکلی "
(۱۳) ماڈل بک سٹال .. ڈولٹن مارکیٹ دی مال "
(۱۴) اوریگا بک سٹال .. گلبرگ ۲ ۔ لاہور
(۱۵) پیپلز پبلشنگ ہاؤس
المنار مارکیٹ چوک انارکلی ۔ لاہور

لائلپور:۔ (۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم ۔ اے گلی ۲
بلاک اے نزد پرانی غلہ منڈی ۔ ریل بازار
(۲) شریف سنز بک سیلرز ۔ کارخانہ بازار لائلپور۔
(۳) حافظ محمد یونس صاحب ۔ اے ۷۷ ۔ گلبرگ ۔ لائلپور

کراچی:۔ (۱) محترم محمد اسلام صاحب (۱۰۰/۴) لوئیس روڈ۔
نیو ٹاؤن ۔ کراچی ۵
(۲) ہر اتوار کی صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے
سندھ اسمبلی ہال ۔ بندر روڈ ۔
(۳) گلڈز انجمن کتاب گھر ۔ وکٹوریہ روڈ ۔ صدر
(۴) عوامی کتب خانہ ۔ بولٹن مارکیٹ ۔
(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز ۔ بندر روڈ کراچی ۔
(۶) جنرل بکڈپو ۔ فریئر روڈ ۔ نزد حبیب بنک ۔ کراچی ۔
(۷) اقبال کتاب گھر ہیرسٹ سٹریٹ ۔ کراچی صدر ۔

لیہ:۔ متصل ہوٹل ۔ نزد ریلوے اسٹیشن ۔
ہر جمعہ کو بعد نماز عصر ۔

انگلستان:۔ محترم رشید احمد بٹ صاحب ۔
۱۴۰ سالٹ اسٹریٹ ۔ بریڈفورڈ ۔ ۸

سرگودہا:۔ حکیم حسن محمد نظامی ۔ نظامی دواخانہ ۔
بلاک ۲۰ ۔ گلی تحصیل والی ۔ سرگودہا ۔

میانوالی:۔ صوفی عبدالرحمٰن صاحب جلد ساز
چوک فتح خان ۔ ملک مظفر اسٹریٹ ۔ میانوالی

مردان:۔ (۱) صادق کمیشن ایجنسی ۔ بکٹ گنج
(۲) صدیقیہ انجینئرنگ ورکس ۔ بنک روڈ

ملتان:۔ دانشکدہ حسین آگاہی ۔

راولپنڈی:۔ بک سنٹر ۔ لارنس روڈ

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — یہ قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت - پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچپن روپے

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دل کش مرقع قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیبی ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے

جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان سوالات کا نہایت سادہ اور دل کش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت۔ بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم - ملائکہ - ابلیس - شیطان - جنات - وحی - نبوت کے متعلق قرآنی تصورات (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے - انسان کیا ہے - ان دونوں کا تعلق کیا ہے - تقدیر کسے کہتے ہیں - دعا کا مفہوم کیا ہے (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیم اور فرعون کی آویزش - بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔ جو یوں کہئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰ کی بصیرت افروز داستان حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام
مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ الآراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

Regd. L. No.

MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں

کس طرح مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گذریں۔ اور آج ان کی حالت کیا ہے

قیمت قسم اعلیٰ مجلد : پانچ روپے

جیب ایڈیشن : تین روپے